رادھا اور رنگ محل

از

وزیر حسن دہلوی

فہرست

شمار		صفحہ
۱-	انتساب	۵
۲-	پیش لفظ	۷
۳-	تاج محل	۹
۴-	مہاتما گاندھی	۱۱
۵-	سلطانہ چاند بی بی کے وقائع کا ایک ورق	۱۴
۶-	چار مینار	۱۷
۷-	پنکھڑیاں	۱۸
۸-	مزدور کی موت	۲۲
۹-	بھاگ متی	۲۴
۱۰-	فانی بدایونی	۲۷

شمار		صفحہ
۱۱-	پکوان	۲۸
۱۲-	رادہا	۳۱
۱۳-	اقبال	۳۴
۱۴-	رنگ محل	۳۶
۱۵-	ٹیگور	۴۰
۱۶-	کلس	۴۱
۱۷-	ایٹم بم اور تاج محل	۴۸
۱۸-	مارگرٹ	۵۱
۱۹-	پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے	۵۵
۲۰-	شاہانہ سُہاگ	۶۵
۲۱-	اُردو کی ترقی	۶۸
۲۲-	پیام سلام	۸۸

انتساب

(۱)

اسم معرفہ کے معنے نہیں ہوتے۔ یہ ایک مسلّمہ اصول ہے۔ مگر پروفیسر جناب ڈاکٹر زور کے معنے ہیں ادارۂ ادبیاتِ اُردو!

(۲)

حضرت کے روبرو میری زبان سے ایک مرتبہ یہ نکلا تھا کہ میں بھی اپنے مضامین کا مجموعہ چھپوانا چاہتا ہوں۔ وہ دن اور آج کا دن، جب جب بھی ملا انھوں نے اپنے خاص رنگ میں فرمایا :-

"کہاں ہے جناب، آپ کا مجموعہ؟"

"مشفق! میرے پاس نہ مضامین رہے، نہ ان کے مسودے رہے...."

"حضت، آپ بھی بڑے لااُبالی ہیں!"

(۳)

سوچا جینا ہے تو مجموعہ بھی تیار کرنا ہے۔ ورنہ زورؔ صاحب جینے نہیں

دیں گے۔ اس لئے کچھ مضمون لکھے۔ کچھ پہلے کے لکھے ہوئے اِدھر اُدھر سے سمیٹے۔

من قماش فروشِ دلِ صد پارۂ خویشم!

(۴)

ادارۂ مذکور کے موسسِ محترم! آپ یقیناً اُردو کے چاہنے والے ہیں۔ اس کے بھاگ سُہاگ کے لئے ہمیشہ آپ کی یہ تمنا رہی:

صندل سے مانگ، بچوں سے گودی ہری رہے!

مصنف

پیش لفظ

جیون بین مدھر نا باجے چھوٹے پڑ گئے تار!

(۱)

یہ بول آرزو لکھنوی کے ایک گیت سے ہیں۔ زندگی کا نفیس استعارہ۔ میرے دل پر آج ان کا راست اور گہرا اثر ہے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے زندگی کی مدھرتا کم ہوتی جاتی ہے۔ بڑھاپا بھاگا بھاگ آرہا ہے۔ پہلے یہ بات سوچ لیا کرتا تھا۔ اب محسوس ہونے لگی ہے۔ وہ وقت بھی دور نہیں دکھائی دیتا جب، دانت، آنت، آنکھ، کان سب جواب دیدیں گے۔ ہر شے چھین جائے گی!

(۲)

اس وقت رات کا پچھلا پہرا ہے۔ میں کھنڈالہ میں ہوں۔ یہ ایک پہاڑی مقام ہے۔ سطح سمندر سے دو ہزار فٹ بلند، گرمی گئی۔ برسات آئی۔ مینہ کی جھڑی لگی ہوئی ہے۔ یہاں وہاں بوندوں کے جل ترنگ بج رہے ہیں۔ دور نزدیک آبشار گرتے سنائی دے رہے ہیں۔ خیال میں گیت کے بول بار بار گونج رہے ہیں:۔

جیون بین مدھر نا باجے چھوٹے پڑ گئے تار!

میں اوڑھے لپیٹے بیٹھا ہوں۔ اگلی یادگاریوں میں گم۔ یاد سے شباب لوٹ سا آتا ہے۔ گزری باتیں چلتی پھرتی، بولتی چالتی پرچھائیاں بن بن کر جھوم رہی ہیں۔ رات کا اندھیرا انھیں اور جیتا جاگتا بنا رہا ہے!

ان پرچھائیوں میں خوشیاں بھی ہیں۔ رنجوریاں بھی ہیں۔ ہنس بھی رہی ہیں، رُلا بھی رہی ہیں۔

دل چاہتا ہے خوشیاں ہی خوشیاں ہوں۔ رنجوریاں نہ رہیں!

(۳)

رنجوریاں! رنجوریوں کے لئے میں زندگی کو الزام نہیں دے سکتا۔ جھوٹ ہے یہ کہ زندگی خالی خولی ایک خواب ہے۔ جھوٹ ہے یہ کہ بچپن ایک غلطی ہے، جوانی ایک دیوانگی، بڑھاپا حسرت و یاس! زندگی ایک توانائی ہے ـــــ جواں، رواں، دواں، ایک سمپورن نعمہ حسن و مسرت! اس میں جو بھی رنجوریاں ہیں، وہ مجھ سے ہیں!

بچپن غلطی ہے تو ان بچوں کے لئے جن کے بڑے انھیں نہیں سمجھتے۔ شباب دیوانگی ہے تو ان جوانوں کے لئے جن کا بچپن ٹھیک نہیں گزرتا۔ بڑھاپا جو اسی ہے تو ان لوگوں کے لئے جو زندگی سے بھی موت کے کارن ڈرنے لگتے ہیں!

(۴)

سوچتا ہوں زندگی نے مجھے کیا نہیں دیا؟ صحت دی، عزت دی، اولاد دی، عزیز اقربا دیئے، دوست احباب دیئے، تجربہ دیا، وجدان دیا، اس کے اظہار کا حوصلہ دیا۔ پھر بھی کوتاہی ہے تو میری اپنی کوتاہی ہے۔ زندگی کا قصور نہیں۔ اس لئے اپنا الزام دوسرے کو دینا بزدلی ہے!

زندگی ایک بساطِ شطرنج ہے ـــــ ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، پیادے، وزیر، بادشاہ سب اس شطرنج کے مہرے۔ چال چلنے کے قاعدے بھی ہیں۔ اٹل اور اَمٹ۔ چال ہوئی سو ہوئی، لوٹتی پلٹتی نہیں۔ اس لئے جو چال بھی ہم چلیں، جچی تلی، سوچی سمجھی ہونی چاہیئے۔ پھر شطرنج غائبانہ۔ مقابل ان دیکھا ایک استاد۔ چوکے کہ ہرے اور مرے!

(۵)

ان خیالات سے ایک ترنگ آئی۔ "ادب اور زندگی" کے مضامین کے لئے پیش لفظ لکھنا تھا۔ سوچا اس آپ بیتی کو ہی پیش لفظ بنا دوں۔ شاید اس سے کسی کو کوئی بات سوجھے!

مینہ اب بھی برس رہا ہے۔ صبح ہونے لگی ہے۔ یہ سطریں لکھ رہا ہوں کہ دور کویل کوکی۔ میرے قلب و قلم بھی گنگنانے لگے ہیں۔

جیون بین مدھر نا باجے جھوٹے پڑ گئے تار!

دل میں پہلے یاس تھی۔ اب آس ہے!

تاج محل

[گذشتہ مرتبہ تاج محل کی زیارت کو گیا تو خیال آیا کہ دریائے نور کے اس حباب کو دیکھ کر جن جن حضرات نے نظم یا نثر میں کچھ لکھا اُن کا سوادِ تحریر قلب و نظر کا نور بن گیا ہے۔ دیکھوں مجھ کم سواد کو اس دربار حسن سے کیا ملتا ہے۔ یہ خیال آیا تھا کہ احساس میں چاندنی سی کھل گئی۔ نتیجہ یہ واردات ہے۔ مقدور ہو تو دل چاہتا ہے سنگ مرمر کی ایک بڑی لوح پر سنگ سیاہ سے یہ سطریں کندہ کراؤں اور مزار ارجمند کے پائیں بطور پیش کش رکھدوں]

(۱)

یہ پھول، یہ تارا، ایک سیج ہے۔ یہاں نام خدا کون سہاگن آسودہ ہے۔ چاہنے والے بادشاہ کی چاہتی ملکہ، شاہجہاں کی ارجمند بانو!

(۲)

سیج کیا، جاڑے کی دھوپ، گرمی کی چاندنی ہے۔ ہونی بھی چاہیئے کہ دو پیار کرنے والے دلوں کا شاہانہ سہاگ ہے!

(۳)

ایسا سہاگ، ایسی محبت، دل کی خدائی ہے جس کا کوئی شریک نہیں!

(۴)

اسی لئے جب ملکہ ارجمند اللہ کو پیاری ہونے لگیں تو انھوں نے شاہجہاں

بادشاہ سے یہ قول لیا :۔

"صاحبقراں!"

"ملکۂ عالم!!"

"ہمیں بھول لیئے گا نہیں!!!"

"تمہاری یاد میں اپنے کو بھول جاؤں گا کہ دنیا تمہیں یاد رکھے!!!!"

(۵)

اتنا سننا تھا کہ عشق کی آنکھ سے آنسو ڈھلکا، حُسن کے رخسار پر ٹھہرا، دنیا میں تاج محل کہلایا!

مہاتما گاندھی

[ابھی کا ذکر ہے کہ اردو (ہندستانی) کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ مہاتماجی نے اپنی کرپا اور رواداری سے اس کی جان بچائی۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ اپنے محسن کی موت پر وہ آنسو نہ بہائے]

(۱)

ایک پستول سے کچھ گولیاں چلتی ہیں اور سچائی کی ایک پکار کو چپ کر دیتی ہیں۔ وہ آنکھیں مُند جاتی ہیں جو دور دیکھتی تھیں۔ وہ زبان بند ہو جاتی ہے جو سب کو اچھا کہتی تھی۔ وہ دل رُک جاتا ہے جو پرائے دُکھ کو بھی اپنا سمجھتا تھا!

(۲)

دکھ درد کا یہ زمانہ۔ دنیا مادے کی لو بھی۔ ایک دل والا اُٹھ گیا۔ غضب ہو گیا۔ جیسے مادے کی جیت ہو گئی۔ روح کی توانائی ہار گئی۔ اس بات سے کچھ ایسی الجھن ہوئی کہ مہاتماجی کے پُرسے پر دو بول تک نہ لکھ سکا۔ ہزار چاہتا تھا کہ لکھوں۔ نہیں لکھے جاتے تھے۔ جیسے اجالے کے بعد گھپ اندھیرا ہو جائے۔ آنکھیں ہونے پر بھی کچھ سجھائی نہ دے!

بارے اندھیرا کم ہوا۔ اور معلوم ہوا وہ اجالا تو پیار کا اجالا ہے، بلیدان کا اُجالا ہے، ایک مہا آتما کا اُجالا ہے ـــــ سر جیون۔ سنجیوں۔ اس کو کبھی گھاٹا نہیں! میں وہ شام کبھی نہیں بھول سکتا جب یہ خبر سنی تھی کہ مہاتماجی ہم میں نہیں رہے۔

دو ملی کی ایک شام تھی۔ سرما کی سہانی شام۔ شہر میں ادھر ادھر یہاں وہاں رنگ چنگ تھا۔ یکایک آسمان رنگین ہوا گر چپ چپ۔ سمندر بھی رنگین ہوا گر چپ چپ کر رہا ہو۔ پر یہ خبر سنی اور وہی شام گورِ غریباں کی شام بن گئی!

(۳)

کاش مہاتما جی دیس دنیا دونوں کے لئے اور رہتے! مگر ان کی زندگی اب بھی ہمارے سامنے ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اُنھوں نے بھولے بھٹکے کو راہ سجھائی۔ کون نہیں جانتا کہ انھوں نے ننگے بھوکے کا ساتھ دیا۔ دیکھا کہ اس کے پاس کپڑا نہیں تو آپ بھی کپڑا پہننا چھوڑ دیا۔ دیکھا کہ اس کے پاس روٹی نہیں تو آپ بھی اناج کھانا چھوڑ دیا۔ نمک بنایا کہ پیٹ کو روٹی ملے۔ چرخہ کاتا کہ تن کو کپڑا ملے۔ ساتھ ساتھ دیس کی آزادی کے لئے وہ اس سادگی سے لڑے کہ ہاتھ میں تلوار بھی نہ تھی۔ اور یہ لڑائی وہ ایسے وقت لڑے کہ دنیا ایٹم بم بنا چکی تھی! مگر جیت انھیں کی ہوئی کہ سچائی پر تھے۔ سچ ہی کا بول بالا ہوا کرتا ہے۔ اپنی اس جیت سے انھوں نے بتا دیا کہ انسان سچائی اور اہنسا ان سے کام لینا بھول گیا ہے۔ امن کے لئے لڑ مرتا ہے۔ نہیں جانتا امن تو اس میں ہے کہ سارے سنسار سے پیار کیجئے!

(۴)

مغرب کو اپنی مادی طاقت پر اتنا گھمنڈ ہو گیا ہے کہ وہ اس کے لئے بچہ بن گیا ہے۔ یہ بات اندھی اندر اس کو گھن بن کر کھا رہی ہے۔ علم حجاب بن کر اس کی آنکھوں پر آپڑا ہے۔ مغرب کو یہ بات سمجھانے کے لئے بھی مہاتما جی سرتا سر مشرق بن کر سامنے آئے۔ مشرق نے ہمیشہ مغرب کو یہ روشنی دی ہے۔ مشرق! سورج نکلنے کی سرزمین!! مشرق! امیدوں کے ابھرنے کی سرزمین!! مشرق کی طرح

مہاتماجی کے جیون سے بھی ایک اُجالا ہوا، اور چار کو پھیل گیا۔ اِس اُجالے کو وہ "اہمسا" بھی کہتے ہیں۔ مہاتماجی کے پاس "اہمسا" کے معنی ہیں ——— پھوٹ کے مقابلہ میں ایکا، جنگ کے مقابلہ میں سمجھوتہ، غیریت کے مقابلہ میں بھائی بندی، نفرت کے مقابلہ میں محبت، انیائے کے مقابلے میں بلیدان!

اسی کے لئے انھوں نے ہمیشہ اپنے کو جوکھم میں ڈالا۔ اسی کے لئے وہ ہمیشہ ایک اٹل چٹان بنے رہے۔ اسی کے لئے انھوں نے جو سوچا وہ کہا۔ جو کہا وہ کیا۔ جو پڑا وہ سہا۔ اسی لئے ان سے جو جگہ خالی ہوئی اس کے لئے آج کوئی اور نہیں۔

افریقہ نے اس ایشیائی کے لئے ماتم کیا۔
امریکہ نے اس ایشیائی کے لئے ماتم کیا۔
یوروپ نے اس ایشیائی کے لئے ماتم کیا۔
غرض ساری دنیا اس مہاتما سے بچھڑ کر کلپ اٹھی!

(۵)

سچ ہے دنیا ایک اسٹیج ہے۔ سب اپنا اپنا پارٹ کر رہے ہیں۔ کوئی آرہا ہے، کوئی جارہا ہے۔ مہاتماجی بھی آئے۔ اور دنیا کے ایک رہنما کا پارٹ کیا ——— تن کے دبلے، من کے پہلوان، جو دھوتی باندھی ہے اسی کو کندھے پر بھی ڈال لیا ہے۔ جیسے بھارت کا کوئی کسان، کوئی مزدور ہو۔ آنکھ پر عینک، نظر اونچی، قدم بھاری، ہاتھ میں کان کے برابر تک لاٹھی، پوپلے منہ پر ایسی ہنسی جیسے کوئی بچہ ہنسے۔ شام کا وقت ہے، پرند چہچہا رہے ہیں، اور وہ پرارتھنا کے لئے آرہے ہیں۔ لوگ انھیں پرنام کر رہے ہیں، انھوں نے بھی نمستے کو ہاتھ اٹھائے تھے کہ موت کے ہاتھوں نے انھیں ہم سے چھین لیا، ڈراپ گر گیا۔

سلطانہ چاند بی بی کے وقائع کا ایک ورق

[کتاب "چاند بی بی سلطان" کا پہلا حصہ ملک کے سامنے آچکا۔ باقی دو حصے بھی بڑی حد تک پورے کر چکا ہوں۔ یہ چند سطریں تیسرے حصے میں سے ہیں]

(۱)

۱۲ رجب ـــــ وقائع لکھنے میں مجھے اپنی آتون جی کا لکھنا بڑا بھاتا ہے۔ جو کچھ لکھتی ہیں دل لگا کر لکھتی ہیں۔ وہ دل میں اتر جاتا ہے۔ دوسرے لکھنے والوں میں یہ بات کم ہوتی ہے۔ بھاری بول، الجھی باتیں کہ پڑھنے والے کو دِق ہو جائے۔ آتون جی کے لکھنے میں اُن کا اپنا رنگ ہوتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں میں پہچان لو کہ آتون جی ہیں۔ بات بات میں ایک لَے، ایک رنگ، ایک سُبھاؤ۔ آج گھریلو شانتی پر اُن کا لکھا دیکھا۔ سینے میں دھوپ کھل گئی۔ لکھتی ہیں ...... " سچ پوچھو تو ایک دیس کی شانتی اور شادمانی اور بل بوتے کا سُوتا اس کے بسنے والوں کے گھروں کی شانتی اور شادمانی سے نکلتا ہے۔ جو بات گھر میں ہوتی ہے وہی ہمارے آتے جاتے سانس اور دل کی دھڑکن میں سما جاتی ہے اور وہی بات ہوتی ہے جو دیس کے کاموں میں اور بڑی اور اجاگر ہو کر آتی ہے۔ گھر ہی پروان چڑھانے والا ہے۔ گھر ہی انسان بنانے والا ہے۔ اچھے گھر سے اچھا گھرانا، اچھا ونش، اچھی دنیا بنتی ہے۔ ہم ہو بہو وہی رہتے ہیں جو ہمارا گھر ہمیں بنا دے! "

میں چاہتی ہوں اپنے وقائع لکھوں تو ایسے ہی لکھوں۔ سیدھا سادا لکھنا ایک
روشنی کے مانند ہوتا ہے۔ جدھر جائے اجالا!

(۲)

آج سویرے سویرے ارجن کی منگیتر۔ گیتا ارجن کے لئے ستی ہو گئی۔ چتا نے بھڑک کر
زمین کو سرخرو کیا۔ آسمان تک پہنچ گئی۔ یہ میں نے بھی دیکھا۔ بڑا دکھ ہے کہ آج کی بیٹی،
—— کل بہو، پرسوں کی ماں لہلہان اٹھ گئی۔ مگر سکھ بھی ہے کہ پریم اور پیار کے کارن
اٹھی۔ دلہن بنی میرے پاس بھی آئی تھی۔ پالاگن کو بڑھی تو میں نے کلیجے لگا لیا۔ تورہ نے
مجھ سے کہا: "اس ہٹیلی کو آپ ہی سمجھائیے بی بی! ... ایسی لمبی لہکی سانولی سلونی جیون
سیوانہ کرے، ہائے یوں جان جوان اٹھ جائے!!" یہ بات تورہ نے ایسے کہی کہ جو بھی کھڑا تھا
اس کے آنسو آ گئے۔ مگر گیتا جیسی تھی ویسی ہی رہی۔ آنکھ میں نم تک نہ آیا۔ ہاں اس بات کا
اسے بڑا ملال تھا، اور اسی سے جب تک جی چپ چپ رہی کہ ارجن اس سے سکھی نہ گیا۔
ہوا یہ تھا کہ ارجن نے ایک بار گیتا کو ٹھٹھا مار کر ہنستے سن لیا تھا۔ سوچا گیتا لجونتی نہیں
اور جس میں لاج نہیں وہ عورت نہیں۔ جب سے ارجن کھنچا کھنچا رہا۔ الگ الگ ہوتا
گیا۔ سچ ہے محبت اور نفرت ساتھ ہی ساتھ ہیں۔ مگر ارجن کا یوں روس پھول جانا ایک
ہیکڑی تھی! جیتا آدمی ہنستا بھی ہے روتا بھی ہے۔

اُف! گیتا کی چتا اب تک میری آنکھوں میں ہے۔ صبح سے شام ہونے آئی۔
مگر بھلائے نہیں بھولتی۔ آگ کے لال لال لپکتے شعلوں میں بھی وہ مورتی بنی ایسے کھڑی
تھی جیسے دھان کے ہرے ہرے کھیتوں کھڑے رہتی تھی —— بال بکھرے ہوئے، کمر
اور شانوں پر پڑے ہوئے، ہاتھ کا سیدھا پنجہ الٹے شانہ پر، الٹا پنجہ سیدھے شانہ پر۔
یوں بھرے بھرے بازو اور سڈول بانہیں سمٹ کر سینے پر آ گئی تھیں۔ کل کھیت میں

نکلتے سورج کی کومل کرنیں چہرے پر تھیں ۔ آج چتا میں آگ کے دہکتے شعلے ہیں۔ کل ماتھے پر شبنم تھی ۔ آج پسینہ ہے۔ کل پرندے گیت سنائی دیتے تھے۔ آج اپنے پرایوں کے رونے کی چیخیں ہیں ۔ کل محبت کا دکھ تھا۔ آج موت کا سکھ ہے! ایسے میں مگر وہیں کی اس منچلی نے نظریں آسمان کی جانب اٹھائیں جن میں ایک شکایت تھی۔ پھر لبوں پر تبسم کھیلا جس میں ایک حکایت تھی کہ شعلے بپھرے، بھڑکے، بڑھے اور دیکھتے دیکھتے اس مورتی کو چھپا لیا۔ جب گھٹے اور کجلائے تو لوگوں نے دیکھا گیتا نہیں ہے۔ مگر میری نظروں میں وہ اب بھی کندن کا دمکتا ایک نقش ہے!

چارمینار

[شہر حیدرآباد (دکن) کی ایک مشہور تاریخی یادگار جو قلب شہر میں ہے]

قطب شاہی عہد زندگی کی اے یادگار مجسم! تجھ میں ہمارے ماضی کی روح ہے۔
سننے والوں کے لئے آج بھی تیری زبانی ایک پیغام ہے!!

ہماری آزادہ روی کے اے نشانِ منزل! تو اپنی ڈگر لے چلنے پر آج بھی اٹل ہے۔
تجھے دیکھنے والے اور سمجھنے والے ہونے چاہئیں!!

.زرم دوشین کے اے نغمۂ تعمیر! نہ ہو کہ آنکھیں رکھ کر بھی ہم تجھے نہ دیکھیں۔ نہ ہو کہ کان رکھ کر بھی ہم تیرا پیغام نہ سنیں۔ نہ ہو کہ ارتقاء کے نشہ میں ہم اتنے آگے بڑھ جائیں کہ ہاتھوں سے ماضی کا دامن چھوٹ جائے!!

حسن و مفاد کے اے قدیم سنجوگ! تجھ کو سلام!!

پنکھڑیاں

جیسے مٹھی بھر ہیرے ہوں، مگر بن ترشے ویسے ہی ذکیہ کے چند گیت ہیں۔ فلمی گیت نہیں۔ سچ مچ کے گیت! انہیں پنکھڑیوں کا یہ ایک پھول ہے ـــــ ایک گلدستہ، جو اس وقت میرے سامنے ہے۔ اسی کا یہ تعارف۔

ذکیہ مغل شہزادیوں میں کی ایک شہزادی ہے۔ دلّی کے چاندنی محل میں رہتی ہے۔ یہاں سب وہی رہتے ہیں جو کبھی بادشاہ تھے اب فقیر ہو گئے! شریف مگر غریب۔ بھوکوں مرتے ہیں مگر منہ سے کچھ نہیں کہتے۔ فراغ دستی کے بعد تنگ دستی کے نمونے۔ جو من بھاتا کھا نہیں سکتے۔ جو دل چاہتا پہن نہیں سکتے۔ لب پر شکر۔ آنکھوں میں فریاد۔ جس بچے، بوڑھے، مرد، عورت کو دیکھو زبانِ حال سے کہتا سنائی دیتا ہے،۔

جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا میں اُسی کی فصلِ بہار ہوں!

ذکیہ کے دادا ـــــ شہزادہ نواب شوکت علی خاں غدر میں کام آئے۔ باپ کا نام وحید علی خاں ہے۔ انگریزی سرکار سے پانچ روپے ماہانہ پنشن پاتے ہیں۔ اس میں گزر بسر کیسے ہو۔ پان سگریٹ کی دوکان کھول لی ہے۔ پان سگریٹ بھی بیچتے ہیں، مقاماتِ حریری بھی پڑھاتے ہیں۔ پان سگریٹ سے جو آمدنی ہے۔ اس سے پیٹ پلتا ہے۔ پڑھاتے مفت ہیں۔ کہتے ہیں علم بِکا نہیں کرتا۔ ماں سلائی کے کپڑے سیتی ہیں۔ بڑے قرینے کی بی بی ہیں۔ بادشاہ پسند کریلے خوب پکاتی ہیں۔ اِن ماں باپ کی ذکیہ اکلوتی بیٹی ہے۔ ماں سے سلیقہ سیکھا۔ باپ سے علم سیکھا۔ بیگماتی آن۔ بیگماتی زبان!

ذکیہ جب چھ برس کی تھی. جبھی سے اپنے باپ کے اشعار لکھتی بھی تھی. یاد کرکے سنایا بھی کرتی تھی۔ یوں شعر شاعری سے بھی اس کی بسم اللہ ہوئی. اسی زمانے سے خود اس کو بھی کہنے کا شوق ہوا. جیسے جیسے عمر بڑھی. ٹوٹے پھوٹے شعر کہنے لگی. جِی نِی اس چھپتا نہیں. ہوتا ہے تو کوند کر رہتا ہے. اس زمانے میں اس نے کچھ شعر کہے تھے. مثنوی کا رنگ تھا. شعر تو جیسے تھے ویسے تھے. ایک معصوم ہی کے کہے ہوئے تھے. خیال دیکھنے کا ہے۔ وہ یہ تھا کہ باغ میں کہیں گل کھِلا تو بلبل بھی آیا. گل کو دیکھا کرتا. پہروں بیٹھا چہچہایا کرتا۔ ایک وقت آتا ہے کہ گل مرجھا جاتا ہے. بلبل پر اوس سی پڑ جاتی ہے. چپ ہو جاتا ہے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ آیا چپ چپ گل کو دیکھا. اور اڑ گیا۔ پھر نہیں آیا!

ان گیتوں میں سے یہاں میں ایک بول بھی نہیں دوں گا. گلدستہ لیجئے اور پڑھیئے. گیتوں کے تیور اور تصور البتہ دکھائے دیتا ہوں۔ اس بات کی ذمہ داری بھی لیتا ہوں کہ گلدستہ لیکر آپ مایوس نہ ہوں گے. اس میں ذوق وجدان کی لہک مہک پائیں گے. ساتھ ہی ساتھ نورس شاعرہ معاف کرے اگر یہ بوڑھا جو برسوں سے اس کا اور اس کے بڑوں کا خیراندیش ہے، یہ کہتے ہوئے مسکرائے کہ بیٹیا! ادب ذوق ونظر کی دھیمی آنچ پر کندن بنا کرتا ہے. یہ گیت تم چھپوا رہی ہو چھپوا لو. اور جو کچھ کہو اس کے چھپوانے میں حاشا جلدی نہ کرنا. ابھی لکھو اور پڑھو، پڑھو اور لکھو. ذکیہ سے یہ بات میں نے قصداً کہی ہے. اس کے جِی نِی اس سے مجھے توقعات ہیں. جس سے توقع ہوتی ہے اُس کی خیر منائی جاتی ہے!

ذکیہ نے یہ گیت ایسے وقت کہے جب اگلی بندشوں کو توڑ کر ہر ایک اپنی الگ ہی الاپ رہا ہے. بول نئے پرانے دو اسکول بن گئے ہیں. شاعری بھی انقلاب زمانہ سے نئی ہو گئی ہے یا پرانی! ایک کھلتے شاعر کے لئے ممکن نہ تھا کہ اس نئے پن کا اثر نہ

لیتا۔ ذکیہ کی شاعری بھی "جدید" ہے۔ مگر ایک "جدید شاعری" ایسی بھی کہ یارانِ طریقت
نشر لگا دیتے ہیں۔ لوگ واہ واہ کرتے ہیں کہ کیا خوب نظم ہے! ذکیہ کے ہاں یہ بے تکا پن نہیں۔
وہ ماتروں کے الٹ پھیر سے خیال کے نئے نئے روپ دھارتی ہے۔ یہ برائی نہیں۔
ہر ایک آزاد ہے کہ اپنے طور پر بولے۔ شرط یہ ہے کہ آدمی کی طرح بولے! میرے حساب ذکیہ
کے پاس جوش اور اصغر کا پس منظر ہے۔ عظمت اللہ خاں کے لی رک سا فارم۔ نقش ورنگ
اس کے اپنے قلب و قلم سے ہیں۔ اس لئے ہر گیت ایک تصویر ہے۔ اور جو شاید آتی ہی
جوان ہے جتنا میں بوڑھا ہوں!

جوانی سے ہنسا بولنا جوانوں کی فطرت ہے۔ گیتوں میں کہیں کہیں یہ بات بھی ہے۔
جوانوں ہی سے دنیا میں بہار سنگار ہے۔ ادب میں بھی ہمیں انھیں کو دیکھنا پڑے گا۔ ان
ہونٹوں سے نکلی ہوئی باتیں ہی سوندی ہوتی ہیں جن پر ابھی ابھی ماں کا دودھ سوکھا ہے!

اردو ادب کی اس ہونہار بیٹی کے ہاں جو باتیں مجھے اجاگر دکھائی دیں وہ یہ ہیں:۔
سجیلا تصور، رسیلا خیال، نسوانی مشاہدہ، یہ ساری باتیں گیت کی جان ہیں۔ اسطرح
اپنی ادبی سہیلیوں میں ذکیہ سب سے اونچی ہے۔ اس کی بعض باتوں میں تو وہ کیفیت
ہے جیسے علم و ادب کی دیبی ——— سرسوتی اس کے ساتھ گڑیاں کھیل رہی ہے!
سب باتوں سے بڑھ کر ان گیتوں میں برہ کی چاشنی ہے۔ عورت، برہ، اور گیت،
قیامت ہے! یہ سچ ہے کہ پریم اور پیار کس دل میں نہیں۔ سب اس کا مزہ جانتے ہیں۔
مگر کم ہیں وہ جو اس کے اُجالوں کو گنگنا سکتے ہیں۔ مبارک ہے ذکیہ کہ اسے یہ دولت ملی۔
کہتے ہیں محبت اور موت دو برابر کی سہیلیاں ہیں۔ ذکیہ کے حضور یہ دونوں گلے ملتی دکھائی
دیتی ہیں ——— میٹھی میٹھی باتوں میں کسک کا احساس! اس کے ہاں یہ بات اُسی کے دل
سے ہے۔ اس لئے وہ آپ اپنا آسمان ہے!

ان پنکھڑیوں سے یہ گلدستہ بنا بھی ایسا ہے جیسے ایک ڈرامہ ـــــ آنسوؤں سے تو لکھا گیا ہو مگر ختم ہنستے مسکاتے ہو۔ پوری اڑان اس ڈرامہ کی وہ گیت ہے جیسے کسی کا یہ دوہا:۔

کاگا سب تن کھائیو، کھائیو چن چن ماس
دو نینن مت کھائیو کہ پیا ملن کی آس!

مزدور کی موت

[کئی دن ہوئے ایک پینٹنگ دیکھی۔ اس میں کرۂ ارض سے دب کر ایک
مزدور کو مرتا دکھایا ہے۔ پاس ہی اس کے بیوی بچے روتے کھڑے ہیں۔
کرۂ ارض پر کہنی تک نمایاں صرف ایک بہت بڑا ہاتھ بھی بنایا ہے۔ جو
دستِ سوال کی طرح پھیلا ہوا ہے!]

ایک پینٹنگ ہے ــــ مزدور کی موت! اس کا قلمی مرقع میں پیش کرتا ہوں۔
اسے دیکھ کر خدا کرے آپ کا دل بھر آئے۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو آ جائیں!

(۲)

پینٹنگ میں مزدور دنیا کے بوجھ سے دب کر مرا جا رہا ہے۔ ایک بہت بڑا ہاتھ بنایا
ہے یہ اس کی محنت کا ہاتھ ہے۔ آج بھیک کا ہاتھ بن گیا ہے!
دنیا نے چاہا تو کچھ دیدیا۔ اس نے پیٹ بھر لیا۔ تن ڈھانک لیا۔ ورنہ یہ کام کا
دھنی اور اس کے بیوی بچے بے آسرا ہیں!
ذرا اس کے بیوی بچوں کو دیکھئے! کیسے جیتے جاگتے اور زندہ لاشیں ہیں ــــ
وہ قسمتیں جو پھوٹ گئیں، وہ امیدیں جو ٹوٹ گئیں، وہ زندگیاں جو اجڑ گئیں!

(۳)

مگر اے دھن کے لالچی! اس مزدور پر مت ہنس۔ سن، اس دنیا میں سب ہاتھ
پھیلائے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ مانگ رہا ہے!

تو بھی تو پیسہ پیسہ مانگ کر جمع کر رہا ہے۔ پھر تجھے کیا حق ہے کہ دوسرے کو بھکاری سمجھے اور اس پر ہنسے!

دیکھ، اے پیسہ کے لوبھی! یہ اس کے بیوی بچے ہیں جس نے بھوکا رہ کر تیرے لئے اناج اُگایا۔ یہ اس کے بیوی بچے ہیں جس نے ننگا رہ کر تیرے لئے کپڑا بنایا۔ یہ اس کے بیوی بچے ہیں جو آپ تو ننگا بھوکا رہ کر جھونپڑی میں رہا مگر تجھے محل دیا!

اے محل و حویلی والے! سنبھل کہ طوفان آگیا۔ قہر تیرے سر پر کوند کر کڑک رہا ہے۔ غضب تیرے اوپر ٹوٹ پڑنے کو ہے۔ نہ ہو کہ تیرے ظلم و ستم کے بھنور تجھے ہی ڈبو دیں! اُٹھ، اور مال و عافیت کی زکواۃ دیدے!!

(۴)

بیشک! زمانے کے ہاتھوں وہ بے دردی میٹ کر رہے گا جو کام کرنے والے کا ساتھی نہیں۔ جو دکھ درد والے کا ساتھی نہیں۔

بے شک! زمانے کے ہاتھوں وہی دردمند پھلے پھولے گا جس کا یہ دین دھرم ہو کہ سب کا بھلا، سب کی سیوا، سب سے پیار!

(۵)

یہ لکھ رہا ہوں، اور آنکھیں ان دل والوں کو ڈھونڈ رہی ہیں جو چاند سورج کو ڈھونڈ سکتے ہیں!

وقت ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور دنیا کے بوجھ کو مزدور پر سے ہٹا دیں! مزدور پھر سے اٹھے، سنبھلے۔ پھر سے نڈر ہو کر کام کرے۔ کام اس کی عبادت بنے۔ پھر سے دنیا اونچی ہو کر آگے بڑھے!

بھاگ متی

(۱)

دکن دیس میں آج جو حیدر آباد ہے۔ یہی کل کا بھاگ نگر ہے۔ سرتا سر ایک رومان۔ اس ویلد کی بناؤ تک پیت کی ریت ہے!

(۲)

کہتے ہیں: اگلے زمانے میں ایک شہزادہ تھا۔ محمدؐ قلی نام تھا۔ ایک دن اس نے مجرا سنا۔ بزم میں نئی گائن آئی تھی۔ اس پر نظر پڑی تو دل میں بجلی کوند گئی۔
دماغ نے ٹوکا: یہ سمجھ کی بات نہیں، شہزادہ! گانے والی کہاں اتنا ہانہ پیار کہاں!!
دل نے کہا: نہیں شہزادے، یہ پیت کی ریت ہے۔ اس میں چھوٹے بڑے، ہیں اور تو کا مذکور ہی نہیں۔ قدم بڑھایئے۔ من کا ہیٹا بن کر کیا کیجئے گا!
شہزادہ دل کے کہنے میں آگیا۔ اب وہی گانا جو کچھ دیر ہوتا تھا گھڑی بھر رات گئے شروع ہوا تو سحر ہوگئی۔ راگ دل کی زبان ہے۔ گائن کی ہر تان رنگ رس کی موج بن کر شہزادے کے دل پر چھا گئی!
ویسے بھی ہند میں سنگیت آسمان سے اتری ہے۔ سب کی سب وجدان۔ اس لئے بڑی من موہن ہے۔ اس کے سات سُر سات چاند تارے ہیں۔ ساتوں آسمان طے کر گئے ہیں۔ سرگم کا "سا" چاند کی چاندنی ہے۔ پہلے آسمان سے کھلی ہے۔ "نی" زحل کی دھوپ۔ ساتویں آسمان سے آئی ہے پھر سُروں میں کہیں باوری کوئل کی کوک ہے تو

کہیں منوارے پپیہے کی پی کہاں"!

ایک بزرگ کا تو یہ قصہ سنا ہے کہ راگ کی تانوں ہی من مندر چراغاں کیا کرتے تھے۔ اس مضمون کو کسی مصور نے اتارا بھی ہے۔ کچھ دن ہوئے یہ تصویر دیکھنے میں آئی تھی کہ سنسان جنگل ہے۔ اونچی اونچی پہاڑیاں جنھیں بھورے بھورے بادلوں نے گھیر لیا ہے، اور پہاڑ کے دامنِ کوہ میں دودھ سا دریا بہہ رہا ہے۔ یہیں ایک پہاڑی پر وہ بزرگ دنیا کو چھوڑے شیر کی کھال بچھائے بیٹھے ہیں۔ سامنے میاں سدا رنگ ہیں۔ جو دوزانو بیٹھے بھیروں راگ کا خیال الاپ رہے ہیں۔ صبح ہونے کو ہے۔ مشرق میں بنجارا تارا ابھر آیا ہے۔ مغرب میں پچھلی رات کا چاند ڈوبتا ہے۔ ہاتھ میں تسبیح، چہرے پر نورِ عرفان، لبوں پر ذکرِ یزداں اور ان بزرگ کی بند آنکھوں سے گنگا جمنا بہہ رہی ہے!

تو بزمِ شاہی میں جیسے ہی من کی بنسی بجی، لے ہی دوسری ہوگئی۔ اب گائن نے جو راگنی بھی چھیڑی وہ شہزادے کے دل میں ترازو ہو ہوگئی۔ پچھلی رات سے تو سماں ہی اور تھا۔ راگ کی دیبی کھل کھیلی۔ پریم آگ بھڑک اٹھی۔ کبھی نیند سے آنکھیں مندتیں، اور شمع شعور بجھتی۔ کبھی آرزو ارمان مچلتے اور من کا جوالا بھٹتا۔ ایسے وقت شانت راگوں کی آس رحمت باری بن جاتی ہے۔ کچھ ادھر کی لو لگ جاتی ہے!

بارے چل چل پہ بھیروں کا آستانہ آگیا۔ اسے گائن نے کچھ اس ڈھنگ سے چھیڑا کہ ایک کافر ادا کی پوجا پاٹ آنکھوں میں پھر گئی۔ جیسے بھور بھئی ہے۔ اور گلابی روشنیاں پھیل رہی ہیں کہ وہ پوجا کو آئی۔ سفید مہین پوشاک اشنان سے شور بور، گیلے گیلے بالوں سے بوندیں ٹپکتی ہیں۔ آئی، گورے گورے ہاتھ جوڑے۔ پرنام کیا۔ اور چمپا کے پھولوں کا گجرا مورتی کے گلے میں ڈال دیا!

مگر مثل ہے کہ رات گئی بات گئی۔ صبح ہوئی تو بزم بھی ختم ہوگئی۔ گائن جانے لگی تو شہزادہ نے

یاد فرمایا :-

پوچھا —— کیا نام ہے تمھارا ؟

عرض کی —— بھاگ متی

پوچھا —— کہاں رہتی ہو ؟

عرض کی —— حضور ہی کی اماں میں ہوں ۔ ندی کنارے جس گاؤں کی اُور حضور شکار کو آتے ہیں ۔ وہیں بسرام ہے ۔ وہیں دور سے حضور کے قدم دیکھ لیا کرتی ہوں !

ذرا دیکھئے گا، اتنا کہا نہیں جلتا خیال کو چھیڑ دیا ۔ شہزادے کو کہنا پڑا : " اچھا، کل پھر آئیں گے ! "

(۳)

دوسرے دن شہزادے نے کسی سے کچھ کہا نہ سنا اکیلا گھوڑے پر نکل کھڑا ہوا ۔ ندی کنارے آیا تو دیکھا کہ ندی بھرپور بہہ رہی ہے ۔ جھلّائی اور بپھری ۔ گزر ممکن نہیں ۔ یہ دیکھ کر شہزادہ ذرا کی ذرا ٹھٹکا تھا کہ دیکھا جیسے ندی کے اُس پار بھاگ متی مسکراتی کھڑی کہہ رہی ہے : " لہو میں شاہانہ پن کے ہوتے ندی تو کیا سمندر بھی کچھ نہیں ! "

یہ خیال آیا تو شہزادہ چونک پڑا ۔ گھوڑے کو ایڑ دی ، جھلّائی ندی میں اتر گیا ، اور پار ہوا !

فانی بدایونی

[فانی بدایونی کو مہاراجہ کشن پرشاد کی علم دوستی اور ادب نوازی نے حیدرآباد بلایا۔ مہاراجہ بہادر آنجہانی ہوئے تو فانی بڑی کسمپرسی میں رہے، اور بڑی ہی حسرت ناک موت مرے!]

(۱)

صبر و ضبط کے مجاہد! زمانہ سرد مہر، اور تو گرم احساس! کتنی بڑی آزمائش تھی!!

(۲)

سقراطِ ادب! تو نے بھی زہرابِ غم چپ چاپ پی لیا۔ مگر حسنِ اظہار کی جن گلابیوں میں تو نے اپنا غم چھوڑا وہ تنہا تیرا غم نہیں۔ نوعِ انسان کا غم ہے!

(۳)

درد نصیب شاعر! تیری پرنم آنکھوں زندگانی ایک بروگن ہے ——— سفید پیرہن، بال بکھرے ہوئے، سینہ ارمانوں کا مزار!

کون کہے: یہ زندگانی ہے، تیری شاعری ہے، یا غم کا تاج محل!

پکوان

وقارالنساء بیگم حکومتِ حیدرآباد کے مدرسۂ معلمات میں گھرداری سکھاتی ہیں۔
گھرداری میں سینا، پرونا، پکانا، ریندھنا بھی کچھ ہوتا ہے۔ انھوں نے پکوان پر جو جو باتیں لڑکیوں سے کہیں سنیں ان کو ایک جگہ چھاپا ہے۔ یہ وہی کتاب ہے، نام پکوان ہے۔
یہ کتاب بمبئی میں میرے پاس بھیج کر انھوں نے لکھا ہے کہ میں بھی اس پر کچھ لکھوں۔ اس کتاب پر آغا حیدرحسن کا برناڈ شاہی مقدمہ دیکھ کر سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں۔ آغا حیدر نے تو پکوان پر ایک تاریخ عالم لکھ ڈالی ہے جس میں لگے لپٹے علمِ انسان کی بصیرت بھی ہے! پھر بھی کچھ نہ کچھ لکھنا ہے۔ اُستانی جی کی بات نہیں ٹال سکتا!!
وقار! تم نے بھی کمال کیا۔ خالی خولی کتاب بھیج دی۔ جو پکوان اس میں ہیں ان میں کئی ایک تم خوب پکاتی ہو۔ اور کچھ نہیں تو پستہ بادام کے لوزہی بھیج دیتیں کہ بات میں توانائی اور شیرینی آتی!
پکوان کتاب نہیں شاہانہ دسترخوان ہے۔ طرح طرح کی نعمتیں سجی ہوئی ہیں۔ حیدرآباد کی بریانی، دلّی کے قورمے، لکھنؤ کے کباب، مدراس کے میٹھے، میٹھی چٹنیاں، کھٹی چٹپٹیاں، بارہ مسالے کے اچار۔ قسم قسم کی اتنی نعمتیں ہیں کہ ملیں تو آدمی گھر بیٹھے جنت نعیم پہنچ جائے!
اور تو اور انباڑے کی بھاجی بھی نظر پڑی۔ دکن کی آب وہوا میں چرب مسالوں

کے ساتھ کھٹی کھٹی یہ بھاجی میٹھے تیل میں پکے اور گرم گرم جُویا جوار کی روٹی سے کھانے کو ملے تو انسان انگلیاں چاٹتا رہ جائے! یہ بھاجی دیکھی تو جُویا جوار کی روٹی کا خیال بھی آیا۔ شاہانہ دسترخوان پر یہ چیزیں کہاں! مگر ہم انھیں نہیں بھول سکتے کہ ہمارے کروڑوں بھائی بہنوں کا یہی من و سلویٰ ہیں!

وقار! یاد رکھو، تم ایک انسانی ہو۔ گھر دار کو سدھارنے والی۔ لڑکیوں سے حاشا جُویا جوار کی کرامت کو نہ چھپانا۔ انھیں سمجھا دینا:۔

کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری!

کتاب میرے پاس ابھی آئی تھی کہ میری چھوٹی لڑکی —— عزیزہ سلطانہ نے چھینی۔ ان سے اِن کی سہیلی —— زیب النسار (زیبو) نے چھینی۔ اُن سے ہاتھوں ہاتھ یہ کتاب گرلز کالج پہنچ گئی۔ ایک دن کیا دیکھتا ہوں:۔ بی زیبو منہ تھتھنائے چلی آتی ہیں۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ کالج میں اپنی ایک سہیلی سے لڑ آئی ہیں جس نے کتاب کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی اور کہا کہ ایسی کتابیں ہم لڑکیوں کو نون تیل، لکڑی کے پھیر سے نہیں نکلنے دیں گی۔ اس پر زیبو اپنی سہیلی سے الجھ پڑیں۔ وقار کو خوش ہونا چاہیے کہ کوسوں دور بھی پکوان کا یہ اثر ہے!

میں نے زیبو کو سمجھایا منایا اور کہا: "بیٹیا! میری طرف سے اپنی سہیلی کو دعا کہنا اور یہ بھی کہنا کہ تم بھول میں ہو۔ ہندستانی بیٹی وہی ہے جس کے دل میں گھر ہو اور جس کا گھر دل میں ہو۔ تم یہ نہ بھولتیں تو پکوان کو بھی اچھا سمجھتیں۔ زیبو کو بھی آرزوہ نہ کرتیں!"

اس کتاب کے پکوان پڑھ کر ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک دفعہ برسات کے دن تھے۔ سب برکھا منانے عثمان ساگر گئے۔ یہ حیدرآباد کا بڑا پُرفضا مقام ہے۔ یہاں کئی ندیوں کا

بند باندھ کر ایک بڑا تالاب بنایا ہے۔ بمبئی میں جیسے گیٹ آف انڈیا۔ جہاں سمندر کو تھاما ہے۔ فرق یہ ہے کہ عثمان ساگر کے روبرو ابھی کوئی تاج محل نہیں!

وہاں وقار نے گرم مسالہ کے نسخہ والی مرغی پکائی۔ یہ ان کے پکوان کی خاص چیز ہے۔ بدقسمتی سے میں ان دنوں بھی بمبئی میں تھا۔ سنا ہے پکوان تیاری پر آیا تو مہکا۔ چو طرف اس کی خوشبو ایسی پھیلی ایسی پھیلی کہ تالاب کی مچھلیاں بھی تڑپ گئیں: تالاب سے ابھر ابھر کر ان سے بولیں: ”یا شا، ہمارا بھی ہاہی قلیہ پکا دیجئے!“

کتاب سیدھی سادی ہندستانی میں ہے۔ ہونی بھی چاہیئے کہ لکھنے والی ”اردو کے باغی“ عظمت اللہ خاں دہلوی کی بھتیجی ہیں۔ انھیں ادب کا بھی چسکا ہے۔ کچھ دن ہوئے میں نے ”ہندستانی“ بولنے والی چند بہن بیٹیوں کے خطوط، مضامین، افسانے اور نظمیں منگائی ہیں۔ میں ان کا ایک گلدستہ بناؤں گا۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ گھر داری کی باتوں کے ساتھ ساتھ وہ ادب کی باتیں بھی کیسے ملکاتی ہیں: تارا نے ایک گیت بھیجا ہے۔ جس میں جناب نجم آفندی کے ایک مصرعہ کو جگہ جگہ دہرایا ہے۔

”پریم کہانی کہہ! البیلی جب تک ساجن آئے!“

وقار نے ایک افسانہ بھیجا ہے۔ عنوان تو کچھ اور ہے۔ مگر پکوان کی رعایت سے ادب کی بریانی سمجھئے!

رادھا

[ایک ڈرامائی اسکیچ]

[رات۔ اندھیرا۔ سناٹا۔ جھینگروں کی آوازیں۔ رادھا سجے سجائے کمرے میں مسہری پر سو رہی ہے۔ یہاں دبے پاؤں ایک نوجوان پھٹے حالوں مگر بگڑے تیوروں آتا ہے۔ نام رتیش ہے۔ جیسے ہی رادھا کی طرف بڑھتا ہے ایک اسٹول سے ٹکرا جاتا ہے۔ اور چینی کا گلدان گر کر چھن سے ٹوٹتا ہے۔ رادھا کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ رتیش پر نظر پڑتی ہے تو بولا کر اٹھ بیٹھتی ہے۔]

رادھا ——— تم ؟!

(رتیش جلدی سے ایک چمکتا خنجر نکال لیتا ہے۔ رادھا مسہری سے اتر کر نیچے کھڑی ہو جاتی ہے۔)

رادھا ——— اس کلنکنی کے پاس کیوں آ گئے رتیش! رادھا تمھاری نہیں بن سکی تو سمجھ لیتے مر گئی!!

رتیش ——— ناگن! ڈس لیا تو نے . . . .

رادھا ——— ہاں، ناگن سے بھی زہریلی ہے وہ رادھا جو تمھارے سامنے کھڑی ہے۔

رتیش ——— دھوکہ ہے تو . . . .

رادھا ——— نہیں رتیش، میں دھوکہ نہیں۔ جو ہوں وہی دکھائی دیتی ہوں۔ (رتیش زہر خند

کرتا ہے)۔۔۔۔ سنو! بھوک میں تم بھی جھلس رہے ہو۔ تم بھی جانتے ہو؛ سندر سپنوں سے بھوکے کا پیٹ نہیں بھرتا۔ تن کنگال تو من کنگال۔ پریم کی جگہ بھوک لے لیتی ہے بھوک۔۔۔۔۔ بھوک کی آنچ سے میں نے بھی اپنے پریم کی چتا پھونک دی!

رتیش ـــــ چپ!

رادھا ـــــ نہیں، اور سنو؛ جب کھانے کے لیے ناج کا دانہ جل گیا جب پینے کے لیے پانی کی بوند سوکھ گئی تو دھرتی آکاش تک مجھے بیری دکھائی دیئے۔ میں اندھی بہری سی ہوگئی۔ اور تمھارے پریم کو تج کر اس گھر میں آگئی کہ پیٹ کو روٹی، تن کو کپڑا تو ملے!

رتیش ـــــ تھو ہے سماج پر!۔۔۔ جہاں دیس کی بہت سی بٹیاں اپنے کو اسی طرح بیچ رہی ہیں۔ (رتیش چونک سا پڑتا ہے۔) برا ہے یہ؟۔۔۔۔ برا ہے تو بتاؤ؛ سماج کیوں اس بات کو نہیں دیکھتا سنتا۔۔۔۔ کیوں اس کے آنکھ کان پھوٹ گئے؟۔۔۔۔ برا نہیں ہے، تو جاؤ رتیش! لوٹ جاؤ۔۔۔۔۔ میرے خون سے ہولی مت کھیلو۔۔۔۔۔۔ میں نے جو بھی کہا، ٹھیک کہا۔۔۔۔۔

رتیش ـــــ ٹھیک کہا، رادھا؟!

رادھا ـــــ نش ان کا کیڑا ہے، رتیش! بھوک کی آگ کو بجھانا ہی پڑتا ہے۔۔۔۔ بھول گئے بنگال؟! بھوک ہی تھی وہ بھی!! جس میں ماں باپ نے اپنے بچوں کو کھا کھا کر پیٹ بھرا ہے۔ (رتیش سر جھکا لیتا ہے۔ اور جانا چاہتا ہے)۔۔۔۔ ٹھیرو! ۔۔۔۔ آگئے ہو تو کچھ لیتے بھی جاؤ۔ (خنجر رتیش کے ہاتھ سے چھین کر اپنے آپ کو مارتی اور رتیش کے قدموں میں گر جاتی ہے۔)

رتیش ـــــ (رادھا کو سنبھالتے ہوئے) رادھا!!

راوَنا ـــــ (ڈوبتی آواز میں) .... بہتے لہو کو دیکھو، ڈوبتے دل کو سنو ......
اس میں اب بھی ایک بات پاؤ گے، رمیش! ..... اپنی یاد!!
[مرجاتی ہے۔]

اقبالؒ

[مجھے صدیق نے حضرت اقبالؒ کے اردو اور فارسی شعر منتخب کئے۔ اور
اُن سے ایک "آپرا" تیار کیا۔ اور اصرار کیا کہ اس کا پیش لفظ میں لکھوں۔
میں نے یہ سطریں لکھ کر اس ذمہ داری سے معذرت چاہی۔]

(۱)

اقبالؒ درویش بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، فلسفی بھی ہیں۔ ان اوصاف کے پرتے وہ عروجِ آدم چاہتے ہیں۔ یہی اُن کا برتر انسان ہے۔ جس کی فوقیت کی وہ قدرت تک پر دلیل لاتے ہیں:-

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم   سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کوہسار و راغ آفریدی   خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم   من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم!

اسی مقام کا شخص ان پر کہنے سننے کی جرأت کر سکتا ہے۔ کسی علم و عشق کے ساجن کو ڈھونڈ ھیئے تو بات بنے!

(۲)

بھائی میرے! وہ ایک سمندر ہیں۔ جس کی تھاہ نہیں۔ پیراک سا پیراک بھی اس سمندر میں اترتا گھبراتا ہے۔ سمجھتا ہے چوکا کہ ڈوبا۔ میں تو ان کے حضور جاتا ہوں تو کسی کا یہ کہا سامنے آجاتا ہے:-

"محض ایک بچے کے مانند ساحلِ سمندر پر ہوں۔ کبھی یہ سنگ پارہ یا سیپی اٹھالی۔ کبھی وہ چکنا چکنا سنگ پارہ یا خوش نما سیپی اٹھا کر جی خوش کر لیا۔ ایسے میں علم و صداقت کا ایک ان بوجھا عظیم سمندر ہے کہ میرے روبرو ٹھاٹھیں مار رہا ہے!"

(۳)

علم و صداقت کا یہ عظیم سمندر، پھر شعر کا حسنِ بیان، بات طوفان بن بن گئی ہے! اردو میں ابھی اینگل، بیرسٹری پیدا ہونے ہیں۔ وہ مقاماتِ ذکر و فکر لکھیں گے تو اقبال کے کلام کی داد ملے گی!

رنگ محل

(۱)

یہ جب کا قصہ ہے جب ایران میں سلاطین عباسیہ کا زرّین عہد حکومت تھا۔

(۲)

کہتے ہیں: اُن دنوں شاہی باغ کی ایک مالن تھی۔ سہیل اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ رنگ محل کے باغ میں رہتا تھا۔ گل و بلبل کے ساتھ ہنستا بولتا تھا۔ کبھی سرو کی چھاؤں میں بیٹھا ہے۔ کبھی خیال کے نور میں ڈوبا ہے۔ اس دھوپ چھاؤں میں باغ کی پتی پتی اُسسے کہتی سنائی دیتی: "سہیل! راز زندگانی حسن کاری میں ہے!!" تو اس کی آتما باغ باغ ہو جاتی تھی۔ آخر طبیعت مصوری پر آ گئی۔

ایک دن صبح کا وقت تھا۔ نسیم سحری چل رہی تھی۔ پرند چہچہا رہے تھے کہ سہیل نے پھول توڑے۔ مالن نے گجرا گوندھا۔ صبح سویرے روز مالن گجرا لیکر رنگ محل جاتی اور شہزادی گلروزبانی کو پہنا آتی تھی۔ آج بھی جانے لگی تو سہیل گجرا دیکھ کر کچھ کھو سا گیا۔ بچپن میں یہ بھی رنگ محل جاتا اور شہزادی کو دیکھتا تھا۔ آج اپنے آپ رنگ محل کی بیتی باتیں یاد آنے لگیں۔ ایک خیال آیا کہ جیسے جشن کے دن ہیں۔ شہزادیاں امیرزادیاں رنگ محل آئی ہیں۔ آپس میں چہل پہل ہو رہے ہیں۔ انھیں میں شہزادی گلروزبانی بھی ہے۔ وہ بھی ہنستی بولتی ہے۔ آج وہی ہنسنا بولنا سہیل کی یاد میں کچھ اس طرح بیدار ہوا جیسے ساز کی چھیڑ سے نغمہ جاگ جائے!

سویا تو رات کو خواب دیکھا کہ رنگ محل کے اندر جو نور باغ ہے۔ وہاں گیا ہے۔ اور مرمریں حوض کے کنارے کھڑا ہے۔ جہاں نشاط محل سے گانے کی دھیمی دھیمی آوازیں آ رہی ہیں۔ رات کا وقت ہے۔ چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ قضارا ادھر شہزادی گلرو زمانی بھی آ نکلی۔ اور حوض پر پاؤں لٹکا کر ہو بیٹھی۔ جیسے کوئی بھولا بچہ بیٹھا ہو۔ پھر سہیل کے پاس آئی۔ سہیل کو محسوس ہوا کہ کانپ رہا ہے۔ وہ پوچھتی بھی ہے کہ سہیل اچھا ہے؟ اور اس کی مصوری کی بڑی تعریف کرتی ہے۔ مگر وہ دم بخود ہے!

(۳)

دن گزرا کئے۔ ماں بیٹے روز پھول توڑتے، گجرے گوندھتے رہے۔ مگر اس دن سے سہیل کچھ گُنگ ہو گیا۔ ہر وقت اس پر ایک نیند سی رہنے لگی۔ ماں کی ممتا بیٹے کی یہ حالت کیسے گوارا کرتی۔ پوچھا اور زور دیکر پوچھا تو سہیل کو اپنا خواب کہنا پڑا۔ ساتھ ساتھ یہ بھی کہا: "ماں! میرا دل چاہتا ہے کہ شہزادی بیگم کی تصویر اتاروں۔ تو مجھے کچھ کچھ یہ بتا کہ بڑی ہو کر شہزادی بیگم کیسی دکھائی دیتی ہیں؟" مالن بولی: "چل میں تجھے شہزادی بیگم کا سروپ دکھاؤں۔" یہ کہہ کر سہیل کو سارے باغ میں لئے پھری۔ کہتی جاتی تھی۔ "بیٹا! شہزادی بیگم کے روپ سروپ کا کیا پوچھنا، وہ بڑا شاہانہ ہے۔ بس یوں سمجھ لے، یہ جو سامنے شمشاد ہے، میں سمجھتی ہوں اتنا تو قد ہوگا۔ مگر لانبے لانبے بال اس برابر۔ اے سنبل سے بھی پار ہیں۔ اچھا دیکھ، یہ نرگس ہے۔ اپنے باغ جیسی کہیں نہیں ہوتی۔ اس کی سی آنکھیں ہیں۔ مگر اس میں وہ ڈورے کہاں؟ جو ان میں ہیں! آنکھ ایسی ہے گال جیسے گلاب کی پنیاں! تجھے کیوں کر بتاؤں چہرے پر نرگس و گلاب کھلے رہتے ہیں۔ بھرا بھرا جسم۔ بھرے بھرے بازو۔ پتلے پتلے ہونٹ جن پر پھول سی ہنسی کھیلتی ہو۔ ذرا اس سورج مکھی کو تو دیکھ، اور مجھ بوڑھی کو دیکھ۔ یہ سارے دن سورج کو تکتا رہتا ہے۔ یہی حال میرا ہے میرا کیا سب کا

۔۔ہی حال ہے کہ شہزادی بیگم کو دیکھتے گزرتی ہے۔ میں یہ وہ تو جانتی انھیں اتنا جانتی ہوں، جب سے شہزادی بیگم نام خدا پیدا ہوئی ہیں۔ مجھے تو ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے ہمارے باغ پر بہار آئی ہو!"

سہیل نے شہزادی کا یہ سراپا بھی سنا۔ کچھ اپنی یاد پر بھی زور دیا اور ان دونوں کو ملا کر تصویر اتارنی شروع کی۔ جس سے تصویر میں رنگ ہی اور آیا۔ جوں جوں تصویر اترتی جاتی اُس کا شوق اور بڑھتا جاتا۔ اور وہ اپنی ہر جنبش قلم سے شفق کی سی افشاں چنتا جاتا تھا۔ آخر تصویر پوری ہوئی۔ اچھی تصویر مصوّر کے ہاتھ آنکھ کی شاعری ہوتی ہے۔ فرق یہ ہے ایک رنگ اور خط ہوتا ہے۔ ایک میں لفظ اور خیال۔ قیامت دونوں میں برپا کی جاتی ہے۔ تصویر سہیل نے ماں کو بھی دکھائی۔ وہ دیکھ کر بے چین ہوگئی کہ جس طرح بھی ہو اسے شہزادی کو بھی دکھائے۔ روز چھپا کر ساتھ لے جاتی۔ موقع نہ ملتا تو لے آتی۔

ایک دن شہزادی تنہا بیٹھی تھی۔ مالن گئی۔ مجرا عرض کیا۔ گجرا پہنایا پھر ادب سے یہ بھی عرض کیا: "جان کی اماں ملے تو باندی کچھ عرض کرے۔" شہزادی جانتی تھی مالن بڑے ادب قاعدے کی عورت ہے۔ کوئی ایسی ہی بات ہے جو کہنا چاہتی ہے۔ پوچھا تو مالن نے ڈرتے ڈرتے تصویر نکالی اور عرض کیا! "حضور کا غلام کچھ دن سے تصویریں بنانے لگا ہے۔ ایک دن میرے سر ہو گیا کہ حضور تیری شہزادی ہیں تو میری بھی شہزادی ہیں۔ میں شہزادی بیگم کی تصویر اُتاروں گا۔ میں سمجھی حضور! وہ یونہی کہتا ہے۔ ایسا کون سورما ہے کہ بن دیکھے تصویر اتار لے گا۔ مگر حضور! اس نے یہ کام اپنی یاد سے کیا۔ جن دنوں بچپن میں یہ رنگ محل آیا جایا کرتا تھا۔ حضور کی عمر بالی تھی۔ اس کے سامنے ہوتی تھیں۔ جبھی سے نک سک اس کے دھیان میں ہے۔ جو آج یہ تصویر اتاری ہے۔ یہ سن کر شہزادی مسکرائی۔ تصویر لی۔ دیکھی تو نہال ہو گئی۔ اچھی تصویر کا یہ جادو ہے کہ وہ آنکھ کے رستے دل میں

اُترتی اور پھر وہیں رَم جاتی ہے۔ مگر تصویر دیکھ کر شہزادی نے مالن سے یہ کہا: "مجھے تصویر میں ایک چیز ذرا کم معلوم ہوتی ہے۔ مالن! میرے ہونٹوں کی سرخی دیکھ۔ اتنے پھیکے تو نہیں جتنے تصویر میں ہیں!!" مالن نے کہا: "حضور کی نظر کے قربان۔ مجھ اندھی کو یہ بات بھلا کیا سوجھتی!" اس پر شہزادی بولی: "اس میں سہیل کا بھی قصور نہیں۔ بن دیکھے یہ چیزیں ہوبہو نہیں اتر سکتیں۔ ایک تدبیر ہے۔ مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونی چاہیئے۔ سہ پہر کو ہم تیرے اس باغ میں آتے ہیں وہاں سہیل کو پہلے سے ایسی جگہ چھپا دے کہ ہمیں ایک نظر دیکھ لے۔ جبھی یہ کمی پوری ہوگی!"
مالن خوش خوش باغ آئی۔ سہیل کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ وہ بھی باغ باغ ہو گیا۔

(۴)

سہ پہر کا وقت تھا۔ باغِ حیات بخش میں شہزادی گلرو زمانی کی سواری بادِ بہاری آئی۔ چوطرف پہرہ بندی تھی۔ اونچی پوری خوبصورت ترکنیں ہاتھوں میں تیر کمان لیے کھڑی تھیں۔ شہزادی ہوادار سے اُتری۔ مالن کے ساتھ ساتھ وہاں آئی جہاں سے سہیل اسے دیکھ لے۔ سہیل نے شہزادی کو دیکھا تو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ اسی کی دید میں محو تھا کہ ایک ترکن نے اسے دیکھ پایا۔ جھٹ کمان کو چلہ کیا۔ تیر جوڑا۔ اور شست باندھ کر ایسا چھوڑا کہ سہیل کے کلیجے میں ترازو ہو گیا۔ منہ سے آہ نکلی، دل سے خون کی بوند اُڑی، اور تصویر کے لبوں پر گر کر رچ گئی!

ٹیگور

[مہاتما گاندھی انھیں گرو دیو کہا کرتے تھے۔ ادب میں اپنے خاص انداز سے یہ یقیناً ایک گرو دیو ہیں۔]

ٹیگور کا دل رنگ، روشنی، اور راگ کا ایک پنگھٹ ہے۔ دنیا ـــــــ مست جت کی دیوانی، اس پنگھٹ پر آ کے بھی نہ دیکھ سکی کہ مستاؤں کے جگھمٹے کیا کیا گاتے سنائی دے رہے ہیں :-

"...... داتا! اندھوں کو آنکھیں دیدے، مردوں کو جیون دیدے، اس دھرتی کے من سے اندھیرا لے لے۔ اُجالا دیدے!"

دنیا ـــــــ دل کے گنی! من کے گاہک!! بہار ین ناچ رہی ہیں۔ تارے ساز بجا رہے ہیں، پریم گاگر بھی بھری رکھی ہے، آ کہ سبھا کو تیرا انتظار ہے!

روحِ ٹیگور ـــــــ سکھی، میں آج ساجن کے دوارے ہوں۔

اُن پر چاند سورج وار رہی ہوں۔ وہ میری یہ پوجا دیکھ دیکھ مسکرا رہے ہیں۔ مجھے فرصت کہاں ؟!

نکلس

[یہ ملک فرانس کے پرستانِ ادب کی ایک پری ہے، جسے ہندستانی شیشے میں اتارا ہے۔]

(۱)

سلمیٰ کا جیسا نام ہے۔ ویسا ہی روپ بھی تھا۔ خدا کی دین کے جو لوگ قایل نہیں، انھیں حیرت تھی کہ تمیز تہذیب کی یہ دلاری ایک غریب گھرانے پیدا کیسے ہو گئی!

فطرت کی یہ لاڈلی روکھی سوکھی کھا لیتی۔ موٹا جھوٹا پہن لیتی۔ یوںہی زمانہ گزر گیا۔ آخر ایک دن وہ آیا کہ ماں باپ کی دعاؤں کا جہیز لیکر سلمیٰ ایک غریب کے سہرے کا پھول بن کر کھِلی!

(۲)

کہتے ہیں عورت کی ساری ذات جماعت اس کی عصمت، صحت، سلیقہ اور ہنستی پیشانی ہے۔ شرمیلی چتون اور میٹھی زبان سونے پر سہاگہ! مگر سلمیٰ کی ان خوبیوں کو غربت کا کچھ ایسا گھن لگ گیا تھا کہ کسی کو سوجھ ہی نہ پڑیں۔

وہ آپ ہی آپ سوچتی: "الٰہی! بارہ برس میں تو کوڑی کے دن پھر جاتے ہیں۔ میرے کڑوے کسیلے دن انیس برس میں بھی نہ کٹے۔ "اِن" کو دیکھتی ہوں تو کسی سے ملنے کے نہ جلنے کے۔ کہیں جائیں تو چار جائیں پہچانیں۔ مگر کہے کون؟ اور کرے کون؟ مارا باندھی کچہری چلے گئے۔ چلے آئے۔ کچھ دیر دوستوں میں ہنسے بولے۔ نہیں تو کتاب سنبھالی۔ مجھے "لاٹ صاحبہ" کا یہ حکم ہے کہ میں جب گھر میں آؤں تمھیں ہنستا دیکھوں۔ باتوں باتوں کبھی کچھ کہہ دیا تو

فرما دیا کہ بیگم! رزق کی تنگی و فراغت، انسان کے بس کی بات نظر نہیں آتی۔ جتنا ہو سکتا ہے میں خود کئے جاتا ہوں۔ خوشامد آتی نہیں۔ جوہر ذاتی کوئی پوچھتا نہیں۔ یہ سب دیکھتے تم آزردہ ہوتی ہو تو اس سے حاصل؟ جو کچھ ملتا ہے اسے ہی کافی جانو تو بہت ہے۔ ورنہ خدا کی خدائی بھی تھوڑی ہے۔ سچ ہے انسان سدا کا ناشکرا ہے۔ اسے جتنا ملے تھوڑا!"

یہ سوچتی ہوئی سلمیٰ سہاگ سیج سے اٹھی۔ دونوں ہاتھ اٹھائے۔ انگڑائی توڑی۔ جمائی لی۔ سامنے بڑا آئینہ تھا۔ اس میں سیج کے لال پردے کے ساتھ ساتھ سلمیٰ کا عکس بھی پڑا جیسے صبح کی گلابی روشنی میں نکلتا سورج جھلکے!

(۳)

سلیم ایک دن شام کو کچہری سے آیا تو بڑا سا دعوتی رقعہ ہاتھ میں تھا۔ اسے ہنستی پیشانی گھر والی کی گود میں ڈال دیا :-

"تمھارا رقعہ بھی آفس پہنچ گیا!"

"اچھا! کس کے سہرے کے پھول کھل گئے؟!"

سلمیٰ نے رقعہ لیا۔ کھولا ___ پڑھا۔ رقعہ پڑھ کر سلمیٰ کی شگفتگی کچھ بجھ سی گئی :-

"چپ چپ ہو گئیں؟"

"نہیں۔"

اتنے میں ماما نے تخت پر صاف ستھرا دسترخوان چن دیا۔ یہ سارس کا سا جوڑا اُدھر آ گیا۔

"چلی جاؤ نا، تم نے تو آنا جانا ہی چھوڑ دیا۔"

"جی ہاں، کہیں آنا جانا کیا آسان بات ہے۔ کپڑا لتّا، زر زیور بھی چاہیئے۔"

یہاں سلمیٰ کی موتی چور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

"کپڑے لتّے کی تو فکر نہ کرو۔ اس کا انتظام میں کئے دیتا ہوں۔ سو روپیہ کوا پرپٹیو سائی سے لے لوں گا۔ زر زیور نہیں تو نہ سہی۔ ایسا ہی ہے تو گلے میں پھولوں کا گجرا پہن جانا۔"

"اے ہوش میں آئیے۔ آپ کو تو ہر وقت مذاق سوجھتا ہے۔ نوج ایسے موقع پر کوئی پھول پہنے۔ وہاں بیویاں سونے میں پیلی، موتیوں میں سفید آئیں گی۔ میں پھولوں کا گجرا لٹکائے پھروں۔ کیا کہنے ہیں!"

بعد میں یہ تجویز ہوئی کہ ہاتھ گلے کے لئے عاصمہ کے ہاں سے کچھ منگا لیا جائے۔ جوں توں رات گزار دی۔ دوسرے دن سواری منگوا سلمیٰ اپنی سہیلی ــــــ عاصمہ کے ہاں جا پہنچی۔ سواری سے ابھی اتری نہ تھی کہ عاصمہ آکر لپٹ گئی۔

پھر باتوں باتوں کو ارپے کے دن اس طرح یاد کئے کہ گرمی اب بھی آتی ہے۔ گلیوں میں پھیرے پھول بیچتے پھرتے ہیں۔ مگر اس وقت پھولوں کے خیال سے دل کی کلیاں کھل جاتی تھیں! اکثر دو منزلے پر ہم تم بیٹھے چاندنی کا انتظار کیا کرتے تھے۔ ادھر چاند نے گھیت کیا۔ ادھر ہم نے آنکھ مچولی شروع کی! ہائے، برسات کا وہ امنگوں بھرا جھولا، اور مزے مزے کے تمن اب کہاں؟! ان دنوں روم جھوم بادلوں کا آنا، کوئل کا کوکنا، خوشی کا پیام تھا۔ میٹھی میٹھی پھوار، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، گیت، سنگیت بہار دے جاتے تھے! سردیوں میں اقصے کہانیوں کی کیسی بھرمار ہوتی؟ اور اب تو زندگی ہی ایک کہانی بن گئی ہے! کیوں سلمیٰ، جاڑے کی وہ سنسان پہاڑ سی راتیں بھی تھیں یاد ہیں جو صندل جہاں پاشازادی کی کہانی کسی طرح ختم ہی نہ ہوتی تھیں!

یوں ایک ایک بات یاد آتی۔ گزرے زمانے کی خوشنمائی انھیں لبھاتی۔ اس میں دوپہر ہوگئی۔ کھانا کھایا۔ دو بجے۔ تین بجے۔ چار بج گئے۔ سلمیٰ نے رخصت چاہی اور دبی زبان سے مدعا بھی کہا۔ عاصمہ نے اسی وقت گہنے کا صندوقچہ لا سامنے رکھ دیا کہ اس میں سے

جو جو چیزیں پسند آئیں لے جاؤ، میں نے روکا ہے!

عاصمہ کھاتے پیتے ایک شریف گھرانے کی بیٹی تھی۔ یہ کچھ اپنے سے زیادہ اوروں کو پہنا اوڑھا کر خوش ہوتی تھی۔ اس نے خود اپنے آپ چیزیں سلمیٰ کو پہنا کر دیکھنی شروع کیں۔ یہ پہنایا۔ وہ پہنایا۔ عاصمہ جانتی تھی کہ پہنا اوڑھنا بھی ایک شے ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ آدمی کس طبیعت کا ہے۔ ہوتے ہوتے پازیب اور نکلس پسند کیا۔

(۴)

بڑے انتظار میں بلاوے کا دن آیا۔ سلمیٰ بن سنور کر جمیل منزل پہنچی۔ سارے مہمانوں میں ایک تھی۔ ہر ایک کی نظر پڑتی۔ بے ساختہ تعریف نکلتی۔ عزیزہ فاطمہ کی نانی سلمیٰ کا سلیقہ جانتی تھیں۔ انھوں نے عطر، پھول، پان کا اہتمام سپرد کر دیا۔ رات کو گانا ہوا۔ صبح صبح محفل برخاست ہوئی تو سب شامیانے سے کمرے اور دالانوں میں آئے۔ ایک کمرے میں سلمیٰ بھی ایک قدِ آدم آئینہ کے روبرو کھڑی ہو کر اپنی سج دھج دیکھنا چاہتی تھی کہ بیساختہ اس کی چیخ نکل گئی۔ نکلس کھو گیا!

سلمیٰ نے ادھر ڈھونڈا ادھر ڈھونڈا۔ ہزار سوچا کہ کہاں گرا، کدھر کھو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ گھر والی بیوی کو بھی معلوم ہوا۔ انھوں نے تل کی دھرتی اوپر کر دی۔ نکلس کا پتہ چلنا تھا نہ چلا۔ ہار جیت کر سلمیٰ نے گاڑی منگوائی اور گھر روانہ ہوئی۔ راستہ میں ایک خیال آتا ایک جاتا تھا۔ کبھی دم گھٹنے لگتا۔ کبھی دھڑکن ہونے لگتی۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ چہرہ دل کا آئینہ ہوتا ہے۔ سلمیٰ گھر میں اتری تو چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑی بندھ گئی تھی۔ دم بدم ٹھنڈا سانس لینے کو جی چاہتا تھا۔ سلمیٰ نے بہتیرا اپنے کو سنبھالا۔ جی تھا کہ بھرا آتا تھا۔ سلیم نے جو یہ دیکھا تو سمجھ گیا ضرور کچھ ہوا ہے۔ باتوں باتوں پوچھا تو سلمیٰ نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔

اس ناگہانی کا یہ بات تو نہیں کہ سلیم پر کچھ اثر ہی نہیں ہوا۔ مگر وہ ہراساں بھی نہیں ہوا۔ اس کے دل میں تیزی سے جو باتیں گزریں وہ یہ تھیں کہ نکلس گیا جائے۔ قسمت تو نہیں لے گیا۔ وہ زندگی ہی کیا جو حوادث سے نہ ٹکرائے۔ سلمیٰ کو دلاسا دینا چاہیے۔ عورت کا دل کتنا، ایسا نہ ہو اثر لیکر وہ بیمار پڑ جائے۔ اس لئے کہا: "سلمیٰ! تم جانتی ہو، عورت کے معنی ہیں ـــــ خوشیاں بڑھائے، رنجوریاں کم کرے۔ نکلس گیا جانے دو۔ صدقہ گیا۔ پازیب واپس کر دو۔ اور لکھدو نکلس کا کھٹکا بگڑ گیا ہے۔ ٹھیک کرا کے بھجوا دوں گی!"

اس وقت سے سلیم کی عجیب حالت تھی۔ دوکان دوکان پھرتا تھا کہ یاقوت کا ویسا نکلس کہیں مل جائے۔ یا کوئی جلدی بنانے کی حامی بھر لے۔ کوئی حامی نہ بھرتا تھا۔ ایک نے ہزار روپے لاگت بتائی۔ سلیم کو جلدی تھی۔ ہاں کرنی پڑی۔ مگر پاس اتنی رقم نہ تھی۔ ناچار قرض لیا۔ ہزار روپے قرض لے تو لئے۔ مگر خون خشک ہو گیا۔ سود ایسی جہاجنی جونک ہے کہ اس سے اچھے اچھے نہیں پنپ سکتے۔ ہزاروں کی ملک سیکڑوں کے تمسک میں دیکھتے دیکھتے برابر ہو جاتی ہے!

نکلس تیار ہو گیا۔ تیسرے دن سلمیٰ خود لیکر گئی۔ دل میں خلش تھی کہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ اگر عاصمہ نے پہچان لیا تو شامت آجائے گی۔ مگر عاصمہ نہ نہیں پہچانا۔

(۵)

عاصمہ لاہور گئی۔ واپس بھی آگئی۔ دو ڈھائی برس آنکھ بند کرتے گزر گئے۔ مگر سلمیٰ کو ایک ایک دن ایک ایک برس تھا۔ قرض نے گھر کی برکت اڑا دی۔ ماما تک کو جواب دیدیا اور گھر کا سارا کام کاج سلمیٰ پر آپڑا۔ اس طرح دیکھتے دیکھتے اتنی جھٹک گئی کہ چلتی پھرتی تو معلوم ہوتا جیسے بیمار ہے۔ بچاری پھر بھی اپنے کو گھسیٹے جاتی۔ چہرے پر وہ اگلی سی بات نہ رہی تھی۔ دل کی بھی عجیب حالت ہو گئی تھی۔ ذرا کسی نے پوچھا کہ سلمیٰ! تم بہت جھٹک گئیں۔ چپ چپ

بھی رہنے لگی ہو۔ کیوں؟ کیا بات ہے؟ اور اس کے دل میں دھواں سا اٹھا اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے!

تسلیم کو بھی اس کا بڑا احساس تھا۔ دن کو دفتر جاتا۔ رات کو معاوضہ پر اخباروں میں ترجمہ کرتا۔ ہزار جتن کرتا تھا کہ کسی طرح قرض کا پھیر نکلے۔ مگر وہ جوں کا توں نظر آتا تھا۔ کبھی کبھی اس طرح سلمیٰ کا دل بھی بڑھاتا تھا: "سلمیٰ خوشی کا راز اس میں ہے کہ انسان اپنے آپے سے نہ اُپرائے۔ ہراساں نہ ہو۔ یہ دن بھی نہیں رہیں گے۔"

(۶)

لاہور سے آکر یوں تو عاصمہ دو تین دفعہ سلمیٰ سے مل چکی تھی۔ مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سلمیٰ دن بدن کیوں گھلے جاتی ہے۔ بہتیرا پوچھا۔ مگر سلمیٰ نے ہنس بول کر ٹال دیا۔ سوچ سوچ کے آخر عاصمہ نے یہ ترکیب نکالی کہ سلمیٰ کی ماما کو ڈھنڈوا بلوایا۔ اور منا پھسلا کر اس سے سلمیٰ کی ساری بپتا سن لی۔ پھر اپنی بیماری کا بہانہ کر کے سلمیٰ کو رقعہ لکھا۔

سلمیٰ پہنچی تو دیکھا کہ عاصمہ وہی نکلس پہنے اچھی بھلی ڈیوڑھی میں کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ پاس سلمیٰ کی ماما بھی کھڑی ہے۔ یہ دیکھ کر سلمیٰ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ سمجھ گئی کہ راز افشا ہو گیا۔ ادھر عاصمہ بھی رکی رکی ملی۔ سب دالان میں پہنچے تو عاصمہ نے کہا: "کیوں سلمیٰ! یہ کونسی انسانیت تھی کہ نکلس والے معاملہ کا تم نے جھوٹوں بھی مجھ سے ذکر نہ کیا۔ تمھیں یہ بات زیبا تھی کہ ------"

یہ شکوہ سن کر سلمیٰ بلبلا گئی۔ کہا: "عاصمہ! اب کچھ اور نہ کہو۔ میں خطاوار ہوں۔ ساتھ کے کھیلے کی لاج ہے تو سمجھ لو اس وقت میری آبرو تمھارے ہاتھ ہے۔ میں جانتی ہوں تمھارا نکلس قیمتی تھا۔ مگر خدا جانتا ہے وہ کھو گیا۔ جلدی میں جیسا بن پڑا بنوا کر تمھیں بھجوا دیا تھا۔ کیونکہ تم لاہور جا رہی تھیں۔ اپنے نکلس کی قیمت بتا دو۔ وعدہ کرتی ہوں کہ مہینے دو مہینے میں رقم

دیدوں گی۔ کیا کروں، ہمت نہیں پڑتی تھی۔ ورنہ ان دنوں جب بمبئی میں تم سے ملنے آئی۔ ارادہ کر کے آئی تھی کہ تم سے قیمت پوچھوں گی۔"

یہ سن کر عاصمہ کا دل بھر آیا۔ کہا: "یہی تو کہتی ہوں بے وقوف! میرا نکلس امیٹیشن تھا۔ اس کے لئے تو نے ناحق یہ کڑی جھیلی!!"

یہ کہتے ہوئے آگے بڑھی۔ اپنا نکلس اتار اُٹلی کے گلے میں ڈالا۔ اور ہاتھ بھی گلے میں ڈالدیئے!

ایٹم بم اور تاج محل

(۱)

بجلی کوندی، گرج ہوئی، زمین ہلی، آسمان لرزا :-

"کیا ہوا ؟!"

"کیا ہے ؟!"

"کون گرا ؟!"

"ایٹم بم !!"

(۲)

شام ہو رہی تھی۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ پرند بول رہے تھے۔ اجالا سمٹ رہا تھا۔ ایسے میں کچھ صنم تاج محل دیکھنے آئے :-

کلو پیترا ـــــ واہ جی، ارجمند بانو بیگم! تم نے عورت ذات کی لاج رکھ لی!!

قرۃ العین ـــــ اپنے پیار کو اتنا بلند کیا کہ ہماری ہار بھی جیت بن گئی!

سافو ـــــ رات کو تارے چمکتے ہیں اور کجلا جاتے ہیں۔ دن کو پھول کھلتے ہیں اور مرجھا جاتے ہیں۔ مگر اے ملکۂ حسن و محبت! تیری یہ آرام گاہ وہ پھول تارا ہے جو رہتی دنیا تک چمکتا جھمکتا رہے گا!

اتنا کہہ کر یہ صنم خراماں آگے بڑھ گئے۔

(۳)

پرندا ور چھپائے۔ مامائیں، اصیلیں، مغلانیاں بھاگا بھاگ آئیں اور تاج محل کے صحنِ چمن میں زرتار فرش فروش کیا۔ پھر ملکہ تاج تشریف لائیں۔ الہیٰ قدر، الہیٰ شان۔ سب نے مجرا عرض کیا:۔

ملکہ بیگم ——— آج یہ کیا شور تھا، مغلانی؟

مغلانی ——— حضور، سُنا ہے: دنیا تباہ ہو رہی ہے!

ملکہ بیگم ——— کیسے؟

اصیل ——— حضور، کہتے ہیں: عورت میں حیا، مرد میں وفا نہیں رہی!

مغلانی ——— حیا بھی بک رہی ہے، وفا بھی بک رہی ہے!

اصیل ——— زندگی بیوپار بن کر رہ گئی ہے!

ملکہ بیگم ——— کیوں؟

مغلانی ——— حضور! ہے یہ کہ دنیا مادے کی کنوٹڈی بن کر رہ گئی ہے۔ روح کی باتیں ایسی بھول گئی ہے جیسے کوئی بات ہی نہیں!

اصیل ——— اس سے ہو رہا ہے، حضور! کہ دل سے اطمینان گیا، روح سے ایقان گیا، یہ تصور گیا کہ قبر کے پار بھی زندگی ہے!

ملکہ بیگم ——— افسوس!

(۴)

بجلی کوندی، گرج ہوئی، زمین ہلی، آسمان لرزا۔

"کیا ہوا؟!"

"کیا ہے؟!"

"کون گرا ؟!"

"ایٹم بم !!"

(۵)

ملکہ بیگم —— کیا ہے ؟

مغلانی —— ایٹم بم !

اصیل —— کل دنیا بنائی جاتی تھی، آج بگاڑی جارہی ہے !

مغلانی —— کل تاج محل بنا، آج ایٹم بم !

ملکہ بیگم —— کیا بلا ہے یہ ؟

اصیل —— حضور ! سنا ہے، آتش گیر مادّے کا یہ وہ شیطانی خلاصہ ہے جسے مٹھی بھر لے کر جدہر پھینکو چار چار فرسنگ زمین دھواں بن کر اڑ جاتی ہے !

مغلانی —— حضور ! یہ بھی کہتے ہیں : بیس بیس فرسنگ زمین کی حیات نابود ہو جاتی ہے !

ملکہ بیگم —— ہاں ! تو پھر چلو یہاں سے، انسان نے زندگی کو آگ لگائی !!

(۶)

پرند چپ ہو گئے، ہر طرف سناٹا چھایا، اندھیرا اجالے کی طرف اور لپکا۔ سورج نے یہ دیکھا تو لرزتا ہوا مغرب میں ڈوب گیا !

مارگرٹ

(۱)

ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، کوئی بھی ہو۔ زندگی اپنے اصول میں سب کے لئے ایک ہے۔

(۲)

ہمارا اُترا دیس میں کھنڈالہ ایک گاؤں ہے۔ ایک برس سے اوپر میں وہاں رہا۔ سطح سمندر سے کوئی دو ہزار فٹ اونچا ہے۔ اونچی اونچی پہاڑیاں، نیچی نیچی گھاٹیاں، اچھی ہوا، اچھا پانی اچھی اچھی دھوپ چھاؤں۔ وہ ایک ایسی بستی ہے جہاں رہنے بسنے، چلنے پھرنے، ہنسنے بولنے کو جی چاہتا ہے۔

وہاں بستی سے دور عیسائیوں کا قبرستان ہے۔ وہیں ایک قبر پر ایک لوح نظر پڑی۔ اس کے اِدھر اُدھر انگریزی میں دو کتبے تھے۔ ایک طرف کے کتبہ میں تھا:۔

"یہاں مارگرٹ کا تن خاکی آسودہ ہے۔ جو ۱۲ر جولائی ۱۹۲۵ء کو اس دارِ فانی سے سدھاری۔ نیکی میں، اور ملنساری میں اور مہربانی میں اس کا سا اب ہونا مشکل ہے۔ پاکبازانہ اور دریا دل، اور بُردبار۔ جو بھی اس سے ملا خوش ہوا۔ کبھی نازیبا بات نہیں کہی۔ کبھی نازیبا کام نہیں کیا۔ عجز و انکسار سے عمر بتا دی۔ ہر ایک کو پیاری، ہر ایک کو پیار کرنیوالی۔ اُن سب کیلئے میری مارگرٹ ایک چراغ ہے جو اسے یہاں آسودہ دیکھتے گزر گیا۔

ڈریک"

دوسری طرف کے کتبے میں تھا:۔

"پیاری مارگریٹ! تیری یاد میں تیرے ولیم کے یہ آنسو ہیں ـــــ روشنائی کے پھول.
وہ جو ہوا کی طرح آزاد تھی، پانی کی طرح آنند۔ وہ جس کا جینا ایک ہنسی تھا،
اور جس کی ہنسی ایک زندگی۔ نہ ہو کہ اس کی باتیں زمانہ بھول جائے۔ اے
تغافل کے ناز! اے تغیر کے انداز!! تجھے سلام۔

ولیم"

ان دونوں الگ الگ کتبوں کے پس منظر میں ایک قصہ ہے۔ اسے اس بوڑھے نے سنایا جو اس قبرستان کی دیکھ ریکھ کرتا ہے۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا: "تم بتا سکتے ہو، یہ مرنے والی کون تھی؟" یہ سن کر اس بوڑھے نے پہلے تو مجھے گھورا، پھر اداس ہوا، پھر نظریں جھکالیں۔ پھر جو نظریں اونچی کیں تو میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ پھر ایک گہرا ٹھنڈا سانس لیا اور کہا کہ مارگریٹ اس گاؤں کے غریب ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ہنستی پیشانی اور سڈول جسم۔ اس کا بیاہ اگر ہوتا تو اسی گاؤں کے ایک نوجوان سے ہوتا، جس کا نام پیٹر تھا۔ اور جو اس سے محبت کرتا تھا۔ مگر نہیں ہوا بنگلور سے دو اجنبی یہاں آئے۔ اور گھاٹ میں ریلوے پر کام کرنے لگے۔ وہ دونوں آپس میں بڑے گہرے دوست تھے۔ ایک کا نام ڈریک تھا۔ ایک کا نام ولیم۔

ڈریک کام سے آتا تو گاؤں میں گھومتا۔ لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا۔ آس پاس کی کئی عیسائی لڑکیاں اسے گھیر لیتیں، ہنستی بولتیں۔ ولیم کام پر سے آتا تو گرجا سنبھالتا۔ اور جو بھی وہاں آتے ان پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالتا۔ کسی سے زیادہ بات چیت نہ کرتا۔ سب کہتے بے وقوف ہے۔ کچھ یہ بھی کہتے اسے ادھر کی کو ہے۔

(۳)

ان دونوں دوستوں کو مارگریٹ سے محبت ہوگئی۔ محبت من کی چیچک ہے تھوڑی

بہت رب کو نکلتی ہے۔ اس محبت کے بارے میں مارگرٹ کبھی اِدھر کبھی اُدھر اس طرح ڈولنے لگی جیسے اس کو قیام ہی نہیں۔ ولیم اس کے پاس آتا۔ اس کو بائبل کی کہانیاں سناتا۔ وہ انہیں سنتی۔ اور جب وہ کہتا: "مارگرٹ! دو اور دو چار ہوتے ہیں" تو وہ ہاں کر دیتی۔ اور سوچتی کہ جینا ہے تو اسی طرح جینا چاہیے۔ اور سب ہیچ۔ وہ کچھ دیر کو بی بی مریم بن جاتی۔ مگر جب ڈریک سیٹی بجاتا یا گنگناتا ہوا اس کے پاس آتا۔ اور سرِ شام اسے کھنڈالہ کی روحانی جنت ـــــــ "بہرام جی پائنٹ" لے جاتا، جو ڈوبتے سورج کے رنگوں میں تو پیار کرنے والوں کا دل بن جاتا ہے، تو اس کا دل بھی اور رنگ سے دھڑکتا۔ اسوقت ڈریک کہتا: "مارگرٹ! دو اور دو پانچ ہوتے ہیں" تو وہ ہاں کر دیتی۔ اور چاہتی کہ شفق کے رنگ و نور میں پہاڑی پہاڑی ڈانس کرے۔ وہ کچھ دیر کو کلو پٹرا بن جاتی۔

یونہی دن ادلتے بدلتے رہے۔ یونہی مارگرٹ اولتی بدلتی رہی ـــــــ کبھی صبح، کبھی شام۔ ایک دن آیا کہ مر گئی!

یہاں میں نے دیکھا کہ محبت، نفرت اور رقابت کا ایک بھاری طوفان اس بوڑھے میں آگیا۔ اور وہ اس طرح کڑکا: "۔۔۔ جہاں عورت نہیں وہاں دیا نہیں۔۔۔۔۔۔۔ جہاں عورت نہیں وہاں دل نہیں۔۔۔۔۔۔ یہ یہ باتیں ہیں جو مرد بنایا کرتا ہے۔۔۔۔ اس نے عورت کو ایک کھلونا بنا لیا ہے۔۔۔۔ یونہی اُس سے کھیلتا رہا، کھیل رہا ہے، کیا یونہی کھیلتا رہے گا؟"

(۴)

جب اس بوڑھے میں طوفان دب گیا تو اس نے رو کر کہا کہ بہتر خود ہی ہے۔ اور کہا کہ افسوس، مارگرٹ نے اپنے آپ کو نہ پہچانا، کبھی یہ نہ جانا کہ وہ خود کیا ہے، اور دوسروں

کے ساتھ بہہ گئی۔ پھر لوح کے پاس سے کچھ ہری ہری گھاس ہٹائی، جہاں اس کے کندہ کئے ہوئے ٹیڑھے ترچھے یہ بول تھے: "مارگریٹ! تو میری ہے!!
پیٹر"

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے

(۱)

[باغِ حیات بخش۔ امرائیاں۔ حضور بہادر شاہ۔ چند مُصاحب اور غالبؔ سب بادشاہ سلامت کے جِلو میں ٹہل رہے ہیں۔]

بہادر شاہ —— اماں غالبؔ!

غالبؔ —— پیر و مرشد۔

بہادر شاہ —— اماں یہ تو بتاؤ آم کونسا اچھا ہوتا ہے؟

غالبؔ —— قبلۂ عالم، وہ جو میٹھا ہو اور بہت سا ہو!

[سب ہنستے ہیں۔ بہادر شاہ کی نظر غالبؔ پر پڑتی ہے۔ دیکھتے ہیں کہ غالبؔ ایک ایک آم کو بڑے غور سے درخت پر دیکھ رہے ہیں۔]

بہادر شاہ —— اماں کیا دیکھ رہے ہو؟

غالبؔ —— پیر و مرشد! سنتا ہوں جو دانہ جس کے نصیب کا ہوتا ہے اُس پر اُس کا نام بھی لکھا ہوتا ہے۔ ان دانوں میں تو کسی پر بھی فدوی کا نام نہیں!

[سب ہنستے ہیں۔ بہادر شاہ خراماں خراماں ایک سمت آکر فرش پر ہو بیٹھتے ہیں، جہاں مسند اور گاؤ تکیہ ہے، اور بیچوان بھی لگا ہوا ہے۔ کنیزیں مورچھل جھل رہی ہیں۔ ایک طرف چونسر بھی بچھی ہوئی ہے۔ آم کے بار آور درختوں کا ہجوم ہے۔ جھوم جھوم گھٹائیں آ رہی ہیں۔ بار بار کوئیل

کوک رہی ہے۔ محلات میں حرم، سریت، سہیلیں، کنیزیں جھولے پر گاتی سنائی دے رہی ہیں:

جھولا کن ڈارو رے امریاں
باگ اندھیرے
تال کنارے
بادل کارے
مورلا جھنکارے
چاروں مِل گیّاں جھول جھلیاں
جھولا کن ڈارو رے امریاں!]

بہادر شاہ ——— اماں احسان اللہ!

احسان اللہ خاں ——— پیر و مرشد۔

بہادر شاہ ——— اماں کل سنکر صاحب سے غالب کی کیا باتیں رہیں؟

[حکیم احسان اللہ خاں، غالب کو دیکھ کر مسکراتے ہیں]

غالب ——— دیکھئے نا، پیر و مرشد! دِلی کالج میں معلم فارسی کی جگہ کے لئے وہ فدوی کو بلواتے ہیں۔ فدوی جاتا ہے۔ وہ پیشوائی کے لئے نہیں آتے۔ فدوی بھی پالکی سے نہیں اُترتا۔

بہادر شاہ ——— اچھا!

غالب ——— جی ہاں..... آخر اُنھیں آنا پڑا۔ مگر کہا: وِل نواب صاحب! دربارِ گورنری میں آپ آئے گا تو ہم پیشوائی کرے گا..... اب آپ نوکری کے لئے آیا ہے..... فدوی نے عرض کیا: گورنمنٹ کی نوکری کا ارادہ اس لئے

ہوا کہ آبرو بڑھے، نہ اس لئے کہ موجودہ عزت میں بھی فرق آئے۔ صاحب نے کہا:
ہم قاعدے سے مجبور ہے۔ فدوی نے بھی کہا: تو غالبؔ بھی عادت سے
مجبور ہے، ایسی نوکری کو سلام!

[سب خوب ہنستے ہیں۔]

(۲)

[غالبؔ اپنے مکان پر پالکی سے اتر رہے ہیں۔ کئی ایک لنگڑے، لولے، اندھے
مرد، عورت، بچے، بوڑھے ان کی پالکی کو گھیر لیتے ہیں۔ غالبؔ بڑی دردمندی اور
دلی لگاؤ سے ان سب کو خیرات دیتے ہیں۔ مکان میں اندر آتے ہیں تو دیکھتے
ہیں کہ ان کے چھوٹے بھائی ——— مرزا یوسف حالتِ جنون میں اِدھر اُدھر
ٹہل رہے ہیں ——— پھٹے ہوئے کپڑے، پھوٹا ہوا سر، جس سے خون بہہ رہا ہے۔
آج جنون زیادہ ہے۔ ایک کوٹھڑی میں بند ہیں، جس کا دروازہ موٹی موٹی فولادی
سلاخوں کا ہے۔ اور مقفل ہے۔]

غالبؔ ——— یوسف! بھائی!!

[مرزا یوسف ٹہلے جاتے ہیں۔ کوئی جواب نہیں دیتے۔ اتنے میں گولہ باری کی
زوردار آوازیں بڑی بہتات میں آنے لگتی ہیں۔]

ایک شخص ——— غدر ہو گیا!

دوسرا شخص ——— غدر!!

تیسرا شخص ——— غدر!!!

[کئی روز بھگدڑ۔ کئی روز قتل و غارت گری۔ ایک رات کا ذکر ہے کہ چو طرف
فوجیوں کی زبردست ناکہ بندی ہے۔ غالبؔ اپنے ہاں ایک ٹمٹماتے چراغ کے

روبرو بیٹھے حالاتِ غدر لکھ رہے ہیں کہ دروازے پر دستک ہوتی ہے۔
غالب اٹھ کر تلوار لیتے ہیں۔ پھر دستک ہوتی ہے۔ غالب تلوار بے نیام
کرکے دروازے کی طرف بڑھتے ہیں۔]

آواز ——— بھیا!

غالب ——— کون؟

آواز ——— بہاری

[غالب جلدی سے دروازہ کھول دیتے ہیں۔ غالب کے دوست
بہاری لال اور ایک بوڑھا ملازم اندر آتے ہیں۔]

غالب ——— خیر ہے؟

بہاری ——— یوسف بھائی!

بوڑھا ملازم ——— رخصت ہو گئے!

غالب ——— یوسف! تو نے بڑی بے کسی کی موت پائی!!

[اسی روز اور رات گئے۔ غالب، بہاری، اور بوڑھا ملازم پاس والی مسجد
کے صحن میں ایک تازی قبر کے نزدیک کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔]

بہاری ——— یوسف بھائی کے سفر کی پہلی منزل آگئی!

بوڑھا ملازم ——— بابا! جو آیا ہے وہ ایک دن جائے گا!!

(۳)

[غالب اپنے ہاں اس طرح بیٹھے ہیں جیسے لکھتے لکھتے کسی کو کوئی خیال
آجائے۔ اس وقت انھیں اپنے بھائی یوسف کی حسرت ناک موت کا
خیال آتا ہے۔ غدر کی باتوں سے بھی دل پریشان ہے۔ معاً انھیں خود ملکہ

موسیقی اُن کا کلام گاتی سنائی دیتی ہے :۔

نے گُلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خون
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز!

اپنا یہ کلام سن کر غالب کو اس کا بھی افسوس ہوتا ہے کہ اُن کی ایسی ایسی باتیں بھی لوگ نہیں سمجھتے۔ ایک ٹھنڈا سانس لیتے ہیں۔ پھر کچھ لکھتے ہیں۔ اور لکھنا ختم کر کے پڑھتے ہیں۔]

"میر مہدی! جیتے رہو۔

بھائی! کیا پوچھتے ہو؟ کیا لکھوں؟ دلّی تو دلی والوں سے تھی۔ وہ کچھ مر گئے۔ کچھ شہر چھوڑ کر چلے گئے۔ اب دلی کہاں؟ ہاں تم آتے ہو چلے آؤ۔ ایک غالب نجات کا طالب رہ گیا ہے سو اسے دیکھ جاؤ۔ ہائے غدر نے ہزاروں کو میٹ دیا! سمجھ میں نہیں آتا ایک غالب کس کس کا ماتم کرے۔ پھر سوچتا ہوں کہ زندگی اسی کا نام ہے۔ قدرت کے کاروبار کچھ ایسے ہی ہیں۔ رات کو تاروں بھرا آسمان دیکھو، کتنی روشنیوں کو کس بے نیازی سے بکھیر دیا ہے۔ نہ بل، نہ بوٹا! ہر گوپال تفتہ کو دعا کہنا۔ میرن صاحب پوچھیں تو کہنا انھیں کچھ نہیں لکھا!"

[خط ختم کر کے غالب اٹھتے ہیں۔ سامنے ہی ایک طرف طوطے کا پنجرا ہے۔ اُدھر سے گزرتے ہیں۔ طوطے کو دیکھتے ہیں۔ چپ چپ بیٹھا ہے تو طبیعت شوخی سے باز نہیں رہتی]

غالب ——— میاں مٹھو! تمھاری جورو نہ بچے، تم کس فکر میں بیٹھے ہو!

[غالب ایک طرف جا کر پلنگ پر لیٹ جاتے ہیں اور سو جاتے ہیں۔ اب اُن سے اُن کا

اُنا (اِگو) جدا ہوتا ہے جو انھیں کا ہمشکل ہے۔ اُن کے اس اُنا (اِگو) کو پہلے اِدھر اُدھر سے قہقہے، پھر پُراسرار آوازیں سنائی دیتی ہیں۔]

ایک آواز ——— غالب! تیرے اشعار ایک پہیلی ہیں!!

غالب کا اُنا ——— زندگی خود ایک پہیلی ہے!

دوسری آواز ——— انوکھے الفاظ!

تیسری آواز ——— انوکھے خیالات!!

غالب کا اُنا ——— یہی غالب ہیں!

[غالب اور اُن کا اُنا (اِگو) پھر ایک ہو جاتے ہیں۔ غالب نیند سے بیدار ہوتے ہیں۔ اور اُن کی نظریں خود بخود آسمان کی طرف اٹھ جاتی ہیں، جو کھڑکی میں سے دکھائی دے رہا ہے۔ اس وقت آسمان پر گھِر گھِر بادل آرہے ہیں۔ کڑاک چمک بھی ہو ہو جاتی ہے۔]

غالب ——— ...میں ہر بات کو تیری طرف سے سمجھتا ہوں۔ تجھ سے لڑتا نہیں، شکوہ ضرور ہے کہ مجھے جیسا بنا دیا ویسا ہوں۔ پھر لوگ میرا کہنا نہیں سمجھتے، مجھے بُرا کہتے ہیں۔ اب یا انھیں تَلِّ نظر، تنگ دل نہ رکھ، یا مجھے ہندستان میں نہ رکھ ——— رُوم ہے، شام ہے، ایران ہے، بغداد ہے۔ یہ نہیں تو خود کعبہ آزادہ مشربوں کی جائے پناہ ہے: آستانۂ رحمتِ عالمین!

ندائے ہاتف ——— جیسے بھی تم ہو، دنیا سے منوا کر چھوڑو۔ یہی تمھاری زندگی ہے۔ یہی تمھاری شاعری!

(۴)

[اب سے غالب اپنی جگہ اور اَٹل ہو گئے۔ جو سوچا وہ کہا۔ جو دل میں آیا وہ کیا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ وہ ہیں اور حالی ہیں کہ انھیں ملکۂ موسیقی پھر اُن کا کلام گاتی سنائی دی :-

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشہ کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا!
افسونِ انتظار، تمنا کہیں جسے

حسرت نے لا رکھا، تری بزمِ خیال میں
گلدستۂ نگاہ، سویدا کہیں جسے

غالب بُرا نہ مان، جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے!

گانا ختم ہوتا ہے تو وہ حالی سے خط لکھواتے ہیں۔]

"میری جان! سُن داستان!! شعر کہنا معنی آفرینی ہے۔ تُک بندی نہیں۔ چاہیے کہ نگاہ چیزوں کے اندر ڈوب جائے۔ لوگ یہ بات نہیں سمجھتے۔ نہ سمجھیں۔ مجھے اچھا نہیں کہتے۔ نہ کہیں۔ تم کیوں بُرا مانتے ہو۔

[اس وقت دو ایک چھوٹے چھوٹے بچے بھاگتے ہوئے آتے ہیں۔ کوئی سیدھا غالب کو جا لپٹا ہے۔ کوئی اُن کی سفید بلّی کے پیچھے ادھر ادھر بھاگنے لگتا ہے۔ کوئی کچھ شرارت کرتا ہے۔ غالب ہائیں ہائیں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں دیکھو، ہم تمھارے چچا تفتہ کو خط لکھوا رہے ہیں۔ دنگا مت کرو۔ بچے قیامت مچا دیتے ہیں۔ ان کی ایک نہیں سنتے۔ اتنے میں اندر سے ایک ماما آکر بچوں کو لے جاتی ہے۔ غالب پھر خط لکھواتے ہیں۔]

"دیکھو تفتہ! اس وقت بھی مرزا غالب کو زندہ دلی نے گھیر لیا۔ میں بیٹھا حالی سے تمھیں خط لکھوا رہا تھا کہ امراؤ سنگھ کے بچے آ دھمکے۔ یہ بہت ستاتے ہیں۔ کھانا نہیں کھانے دیتے۔ حقہ نہیں پینے دیتے۔ دوپہر کو سونے نہیں دیتے۔ کوئی آتا ہے حقہ گرا جاتا ہے۔ کوئی آتا ہے پانی پھینک جاتا ہے۔ کوئی ننگے ننگے پیر پلنگ پر چڑھ جاتا ہے!

[غالب حقہ کا کش لیتے ہیں۔ اور پھر لکھواتے ہیں]

"ہاں بھائی! لکھنؤ گیا، رامپور گیا، کلکتہ گیا، کنگال کا کنگال رہا۔ پنشن ونشن کچھ نہیں ملی۔ دنیا یہ ہے دل یہ ہے کہ میں جہاں رہوں وہاں کوئی ننگا بھوکا نہ رہے۔ بتاؤ کام کیسے چلے۔ آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ جو دکھ پہنچتا ہے، کہتا ہوں: لو مولانا غالب علیہ الرحمہ ایک جوتی اور پڑی!

[حالی بے ساختہ ہنس دیتے ہیں۔ غالب حقہ کا کش لیکر پھر لکھواتے ہیں]

"غذا اب بالکل نہیں چلتی۔ صبح کو شیرۂ بادام، دوپہر کو گوشت کا پانی، شام کو تلے ہوئے چار کباب، رات کو پانچ روپے بھر شراب، اور اسی قدر گلاب!"

[اب پھر پہلے کی طرح ملکہ موسیقی کلامِ غالب گاتی سنائی دیتی ہے:-

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں	خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
ترے سروِ قامت سے یک قدِ آدم	قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری	تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں
بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب	تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں!]

(۵)

[بہاری اور وحشت دونوں امراؤ سنگھ کے ہاں جا کر دستک دیتے ہیں]

وحشت ـــــــ سنگھ جی ہیں؟

[امراؤ سنگھ کے بچے بھاگتے، غل مچاتے باہر آتے اور "وحشت چاچا، وحشت چاچا" کہہ کر وحشت کو لپٹ جاتے ہیں]

وحشت ـــــــ ہائیں ہائیں!...... دیکھو بھئی، شرارت کی سند نہیں۔ نہیں تو ہم جاتے ہیں!

ایک بچہ ——— جاتے کیسے ہیں، آپ؟!

[بچہ وحشت کو لپٹ جاتا ہے]

وحشت ——— ارے بھئی، ٹھہرو تو سہی ......

دوسرا بچہ ——— مٹھائی کہاں ہے؟!

تیسرا بچہ ——— جانا ہے تو مٹھائی دیکر جاؤ!

[اتنے میں امراؤ سنگھ بھی باہر آجاتے ہیں۔ اور وحشت اور بہاری سے باتیں کرتے ہیں۔]

وحشت ——— اماں خیریت ہی تو ہے جو تم تک آئے ہیں!

بہاری ——— مفتی صاحب کے ہاں چلتے ہو؟

امراؤ سنگھ ——— صدر الدین آزردہ کے ہاں؟

وحشت ——— ہاں

امراؤ سنگھ ——— کیوں؟

وحشت ——— کیوں!!..... لو اور سنو!!!

بہاری ——— وہ آج سمجھائیں گے کہ غالب کیا ہیں۔

امراؤ سنگھ ——— کس نے کہا؟

وحشت ——— ایں جانب فرماتے ہیں!

امراؤ سنگھ ——— تو پھر چلو۔

[غالب پر ان دنوں کچھ ایسی چہ میگوئیاں ہوتی ہیں کہ علم و ادب کے خاطر مفتی صدر الدین آزردہ صدر الصدور جیسے ثقہ آدمی کو بھی کہنے سننے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بہاری، وحشت، اور امراؤ سنگھ جب ان کے

ہاں پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ مفتی صاحب بیٹھے دیر سے درس دے رہے ہیں۔
درس کا آخری حصہ ان کے پلّے پڑتا ہے۔]

مفتی آزردہ ——— ..... تو، جب انسان میں سورج کی ہنسی، چاند کی اُداسی آجاتی ہے،
..... جب وہ رنگ سنتا ہے، راگ دیکھتا، ..... جب وہ شے کی روح کو بیان
کرتا ہے، ..... جب وہ آتما کو پرماتما بناتا ہے، تو سمجھو: جب وہ شعر کہتا ہے ...
غالبؔ کے ہاں بھی تم یہ باتیں پاؤ گے ..... ایک وجدان کبھی پرانا نہیں، ایک بیان
جو کبھی پرانا نہیں ..... بعضے شعر تو ایسے کہہ دیئے ہیں کہ خیال ہوتا ہے ہمارے
ہی دل کی باتیں ہیں، ہم بھی ایسا کہہ سکتے ہیں، مگر کہنا چاہیں تو نہیں کہہ سکتے ...
مگر غالبؔ کے ہاں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انسان آسمان سے بھی بڑا جڑا ہے،
پیر فرش پر، منہ عرش کے روبرو، حوصلہ یہ کہ ماوراء سے بھی آگے چلیے .....
دوسرے یہ کہ کائنات تماشائے قدرت ہے، زندگی تمنائے دید:-

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے   عرش سے اُدھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

(۶)

آہ! تو اجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے!

شاہانہ سہاگ

[سلطان علی عادل سے شہزادی چاند بی بی کا بیاہ ابھی ابھی ہوا تھا کہ سلطان کو جنگ پر جانا پڑا۔ نئی نئی بیاہی دلہن ——— شہزادی چاند بی بی نے سلطان کے رن میں جانے سے پہلے تلوار خود اپنے ہاتھوں حمائل کی تھی۔ اسی کا یہ مرقع ہے۔

یہ چند سطریں کتاب "چاند بی بی سلطان" کے دوسرے حصے سے ہیں جو میرے زیر ترتیب ہے]

(۱)

میدانِ جنگ میں رات بھر فوجوں کی صف بندی ہوتی رہی۔ صبح سویرے علی عادل میدان سے اس وقت سراپردے میں آیا جب شمع سے پروانے رخصت ہوتے ہیں!

(۲)

دیکھا کہ چاند بی بی جانماز بچھائے بیٹھی ہے ——— رحل پر سامنے کلام اللہ، آنکھیں بند، چار باغ جو اوڑھے ہوئے ہے اس کا دامن پھیلا لیا ہے، اور دعا مانگ رہی ہے!

یہ دیکھ کر علی عادل نے شوخی سے کہا: "آمین!" چاند بی بی نے پلٹ کر دیکھا اور مسکراتے ہوئے ساری دعائیں دل ہی دل میں علی عادل پر دم کر دیں!

علی عادل اسوقت یہاں اس لئے آیا تھا کہ چاند بی بی نے خاصے کی عباسی اپنے

پاس رکھ لی تھی۔ کہا تھا: "صبح رَن پڑنے سے پہلے آئیے گا، عباسی ہم اپنے ہاتھوں حمائل کریں گے!

چاند بی بی نے جیسے ہی عباسی حمائل کی یہ خیال بھی آیا کہ بازو بھی حمائل کر دے! مگر ضمیر نے للکارا: "ملکہ، بیگم! غازی مرد کو جہاد سے نہیں روکتے!!"

اِس للکار سے چاند بی بی کے بڑھے ہاتھ دعا کے پھیلے ہوئے ہاتھ بن گئے۔ اور ایک اثر کے ساتھ کہا: "خداوندا! مومن کا ہاتھ تیرا ہی ہاتھ ہوتا ہے۔ آج رن میں یہ تلوار اس طرح بلند ہو کہ دیس کا پست بھی بلند ہو جائے!" کہنے کو تو یہ کہہ دیا مگر پھر شرما کر جلدی سے پیچھے ہٹ گئی!

یہ سارا تماشہ ایک قدِ آدم آئینہ کے سامنے ہوتا تھا۔ آتے کے آتے علی عادل جس میں اپنا خود اور جھلم ٹھیک کرنے لگا تھا۔ آئینے ہی میں چاند بی بی کو اپنے پاس سے ہٹتے بھی دیکھا تو شوخی سوجھی۔ پلٹا اور پوچھا: "جائیں!"

چاند بی بی نے نیچی نظروں کہا: "جائیے، اللہ نگہبان!!"

مگر چاند بی بی نے کچھ اِس اَنداز سے کہا: "جائیے!" جیسے کوئی کہے: "آئیے!" اس لئے علی عادل جا نہ سکا۔ اور پاس آ گیا۔ چاند بی بی کے جھکے سر کو اپنی دونوں ہتھیلیوں پر ایک گلدستہ کی طرح سہار لیا۔ اس سے چاند بی بی کی جھکی نظریں ایسے اونچی ہوئیں جیسے گاتی گنگناتی ہوں، اور جب چار ہوئیں تو دونوں میں اس طرح باتیں بھی ہوئیں۔

"بلایا؟"

"نہیں!"

"ہمیں ایسا ہی سنائی دیا!"

"کان بجتے ہوں گے، حضور کے!"

"حضور نے نہ سہی، حضور کی ان کٹیلی آنکھوں ـــــــ سجیلی ترکنوں نے

ضرور بُلایا ہے۔۔۔۔ خاموش رہ کر یہ ہم سے باتیں کیا کرتی ہیں!"
چاند بی بی نے شاہانہ ادا کے ساتھ علی عادل کو دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں!!

اُردو کی تمورتی

(۱)

اس تمورتی میں ایک خاں صاحب (عظمت اللہ خاں دہلوی) ہیں۔ ایک مہدی افادی (مہدی حسن مرزا پوری) ہیں۔ ایک ڈاکٹر بجنوری (عبدالرحمٰن بجنوری) ہیں۔ یہ سب اُردو کے چاہنے والوں میں تھے۔ جان جوان دنیا سے اُٹھ اُٹھ گئے۔ اس سے اُردو کو بڑا جھٹکا لگا۔ ہوتے تو اس کا سہاگ اور بڑھتا۔ میں چاہتا ہوں ان میں سے ہر ایک پر عقیدت کے پھول چڑھاؤں۔ آج خاں صاحب پر لکھتا ہوں۔ آج ہی کے دن انھیں موت کی نیند آئی تھی۔ آج اس بات کو بائیس برس ہو گئے!

(۲)

بہت دنوں کا ذکر ہے کہ حیدر آباد (دکن) میں پلیگ پھیلا۔ شہر والوں نے جنگل جنگل چھاؤنی چھاؤنی۔ خاں صاحب ان دنوں سرکارِ عالی کے مددگار ناظمِ تعلیمات تھے۔ انھوں نے اڈیکمیٹ میں ڈیرے ڈالے۔

ایک دفعہ چاندنی رات تھی۔ بہار کے دن کہ انھوں نے جنگل ہی میں منگل منایا۔ ایک اونچی چٹان پر فرش بچھوایا۔ اور بزمِ سخن سجائی۔ اس میں جوش ملیح آبادی تھے۔ ابوالخیر مودودی تھے۔ امجد حیدر آبادی اور بھی نہ جانے کون کون تھا۔ اونچا مقام، مستانہ ہوائیں، دودھ سی چاندنی، کھِلتے دل، مہکتا موسم، محفلِ شاعری، لطف آ گیا۔ جوش نے اپنی پوری جوشیت سے ایک نظم پڑھی۔ پہلا شعر یہ تھا:

شب کہ حریمِ ناز میں شورِ صد اضطراب تھا
عشق بھی تھا برہنہ سر، حسن بھی بے نقاب تھا!

محفل میں ایک صاحب کے تاڑ اتھا۔ انھوں نے "برہنہ سر" کے الفاظ سنے تو کَن انکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور ٹوپی پہن لی!

امجد حیدر آبادی کی ایک رُباعی جہاں تک مجھے یاد ہے، یہ تھی:

ہر مرتبہ آئینۂ دل دُھلتا ہے
کانٹا کانٹا نگاہ میں تُلتا ہے
میں شاعری کو مراقبہ کیوں نہ کہوں
ہر شعر میں بابِ معرفت کُھلتا ہے!

شاعری کو مُراقبہ اور شعر کو معرفت کہنا واقع میں خوش صفات امجد کو سجتا ہے کہ وہ صاحبِ دل ہیں!

خاں صاحب نے مالوے کی کوکِل کوئل ——— روپ متی کے حسن و عشق کو سراہا کہ یہ اُن کی چیز تھی:-

عشق کی دیوی تھی تو
شعر میں یکتا تھی تو
حُسن کی پُتلی تھی تو
ایک کویتا تھی تو
پیت کی ماری ستی، شاعرہ روپا متی!

خاں صاحب کا بات بات پر وہ ہنسنا بولنا، لہک لہک کر وہ اک ترنمِ خاص سے اپنا کلام سنانا، اب تک میری آنکھوں میں ہے!

(۳)

خاں صاحب اپنے زمانے سے بہت آگے تھے۔ نثر میں اُن کے لکھنے کا ڈھنگ یہ ہے کہ اُردو سے ہنس ہنسائیں۔ مگر ہنسی سوچی سمجھی ہو؛ "وہ ہنسی جس سے سبق بھی ملے جس سے فطرتِ انسانی کا مطالعہ بھی ہو، جو دیرپا بھی ہو، ساتھ ہی دور رَس بھی، عموماً ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں سے ملتے جُلتے تبسم میں ظاہر ہوتی ہے!" یہ پڑھئے اور اُن کے

مضامین پڑھیے ـــــ روغنِ غاز، ڈیڑھ اینٹ، اٹکل لیں، بنیا، ہنسی، یہ، وہ، ان سب میں آپ ہنسی کی ایسی ہی کرنیں پائیں گے!

دوسری بات ان کے لکھنے میں یہ ہے کہ وہ بڑی سی بڑی بات کو اس ڈھب سے کہہ جاتے ہیں کہ سننے والے کو سنبھل کر سننی پڑتی ہے۔ گڑیا خانہ اور سور ناچنا پڑھیے۔ فلسفۂ جبر و قدر کے دو رُخ دکھائی دیتے ہیں۔ ماجد دریا آبادی نے گڑیا خانہ پڑھا تو لکھا تھا: "۔۔۔۔ گڑیا خانہ والے مضمون میں آپ نے فلسفے کو جس طرح پانی کیا ہے وہ میرے لیئے قابلِ رشک ہے!" سر آفتاب احمد خاں وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے سور ناچنا پڑھا تو پھڑک گئے۔ انگلستان جاتے جاتے جہاز ہی سے خاں صاحب کو لکھا۔۔۔ "مجھے مدت سے اس بات کی خواہش تھی کہ ہندستانی نوجوان ادیب اسی قسم کے مضامین لکھیں۔ آپ کے مضمون سے میری یہ خواہش پوری ہو گئی!" خیالی پلاؤ سے شوق کیجیے تو نفسیات کی چیز ہے۔ کہتے ہیں: "۔۔۔۔ خیالی پلاؤ کی خصوصیت، نوعی خصوصیت ضرور ہے۔ ہر انسان میں خواہ وہ مونچھوں والی جنس سے ہو خواہ چوٹی والی صنف سے، یہ خصوصیت ودیعت کی گئی ہے۔ صرف یہی نہیں، قوموں میں بھی کالی ہوں یا گوری، یہ خصوصیت خصائصِ قومی میں داخل ہے۔ آپ کسی قوم کو خواہ وہ مدنیت کے کسی درجے پر ہو، لیجیے۔ اس کے عام خصائص میں آپ خیالی پلاؤ کی ٹٹک یقیناً پائیں گے۔ اور اگر وہ قوم مدنیت کے اس پایہ پر پہنچ چکی ہے، جہاں ایک مولیئر یا ڈکنس پیدا ہو سکے تو آپ اس ٹٹک کو اس قوم کی ادبیات کی دنیا اور ظرافت کے لطیف لباس میں جیتا جاگتا، چلتا پھرتا پائیں گے۔۔۔۔۔ کسی نامعلوم طبعِ خداداد (جی اے ایس) نے شیخ چلی کی صورت میں ہندستانی خیالی پلاؤ کی ٹٹک کو وجود کا جامہ پہنایا ہے۔۔۔۔ کوئی انسان نہیں جو خیالی پلاؤ سے خالی ہو۔ کوئی ہندستانی ایسا نہیں جس نے اس فطری مزیدار [illegible]

میں شیخ چلّی کی شاگردی نہ کی ہو!"

تیسری بات ان کے ہاں ان کی جدت اور نیا پن ہے۔ خود "جی پی ایس" (طبع خداداد) تھے۔ اور بیحد مطالعہ کرتے تھے۔ نئی نئی باتیں پڑھتے۔ نئی نئی باتیں سوچتے۔ نئی نئی باتیں لکھتے۔ ان دنوں جامعہ عثمانیہ کا کتاب خانہ بن رہا تھا۔ انگریزی میں نثر، نظم، فلسفے اور نفسیات پر بیسوں کتابیں آتیں۔ خاں صاحب جامعہ عثمانیہ کے اساسی کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے وہاں کے منتظم سے کہدیا تھا کہ کتابیں پہلے انھیں دیں۔ کسی اور کو نہ دیں۔ لاتے اور گٹھوں سے لاتے۔ مطالعہ کا بھی اچھوتا رنگ تھا۔ کتاب لیتے۔ دو صفحے پہلے کے، دو بیچ کے، دو اخیر کے پڑھتے۔ اس طرح کچھ کتابیں رکھ لیتے۔ کچھ واپس کر دیتے۔ جو کتابیں رکھ لیتے تھے۔ اُن کے بارے میں پوچھا تو کہا یہ وہ کتابیں ہیں جن میں لکھنے والا جو لکھتا ہے اُسے سمجھتا بھی ہے۔ جو نہیں رکھیں وہ ایسی نہ تھیں۔ پھر کہا ایسی کتابیں نہیں پڑھنی چاہیں، جن میں لکھنے والا بات کو نہ سمجھے مگر لکھے۔ ایسا لکھنے والا، مصنف نہیں مداری ہوتا ہے۔ جو گال پھلا پھلا کر، آنکھیں مٹکا مٹکا کر پونگی بجاتا اور ایک پٹارے کے اردگرد پھیرے جاتا ہے۔ سیدھے سادے طور پر پٹارے کا ڈھکنا ہٹا کر یہ نہیں بتا دیتا کہ اس میں کچھ ہے بھی کہ نہیں!

یوں تو ان کی ہر بات نرا رنگ، نیا روپ لئے ہوتی ہے۔ مگر "زندہ بدست مردہ" میں انھوں نے اپنے بے دھڑک اور ہنسوڑ سبھاؤ میں بتا دیا ہے کہ جدّت کیا ہے؟ جدید مجھے ان کا ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک دفعہ گلابی جاڑے تھے۔ ہم سب شمس آباد میں مفتی نواب ضیاء یار جنگ کے ہاں ٹھیرے ہوئے تھے۔ نواب صاحب اگلے وقتوں کی تہذیب و شائستگی کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ عالم بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، رئیس بھی ہیں۔ بلکہ وہ سب کچھ ہیں۔ جس کو دیکھنے سے اپنے اچھے دنوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ وہاں

بڑی یادگار صحبتیں رہیں۔ یہ مقام شہر سے پندرہ میل دور ہے۔ خان صاحب روز سویرے ٹہلنے جایا کرتے۔ میں بھی ساتھ ہوتا۔ وہ ظرافت کی کان تھے۔ ہنسنے ہنسانے کی کوئی نہ کوئی بات کہے ہی جاتے۔ ایک وقت کہنے لگے: "ایک ناول لکھنا چاہتا ہوں، جس کا ہیرو انقلابِ زمانہ سے آدھی عمر عورت رہ کر آدھی عمر مرد بن جاتا ہے! تم دیکھو گے یہ دونوں کردار نفسیات اور جمالیات کے نئے باب ہوں گے، اور یہ بھی دیکھ سکو گے کہ ہندستان کی آب وہوا میں کون زیادہ پھلتا پھولتا ہے!" ایک روز کا ذکر ہے کہ ٹہلتے ٹہلتے بہت دور نکل گئے۔ دیکھا کہ ایک کھلا میدان ہے۔ اس میں ہری ہری دوب کا فرش بچھا ہے، جس پر شبنم کی بے گنتی بوندیں نکلتے سورج کی ملائم دھوپ میں جگر جگر کر رہی ہیں۔ وہاں ہرنوں کی ایک ڈار بھی چر رہی تھی۔ ہمیں دیکھا تو چوکڑیاں بھرتے ہوئے بھاگے۔ کچھ دور بھاگتے، ٹھٹھکتے، پلٹ کر ہمیں دیکھتے، اور پھر بھاگتے۔ یہ سماں دیکھ کر خان صاحب کو بڑا موڈ آیا۔ کہنے لگے: "یہ جگہ ہے۔ یہاں اپنے ماہنامہ کا دفتر بنے۔ کہیں سے تین چار لاکھ روپے ملیں تو یہ جگہ لے کر سب سے الگ اپنی ایک دنیا بسا لیں —— یہ پریس، یہ کتاب خانہ، یہ کام کرنے والے لوگوں کے مکان، یہ مارکیٹ۔ رسالہ کا نام ہو —— جدید! کوئی بات جدت کی سوجھی، لکھ دی۔ ورنہ مہینے کے مہینے کورا رسالہ قارئین کرام کو بھیج کر لکھ دیا کہ ملاحظہ کیجیے!" ایک دو کتابیں اپنے پاس ایسی بھی رکھ لیتے جن کو مہینوں نہ پڑھ سکتے۔ ہر وقت نظر کے سامنے رکھی رہتیں۔ ایک کتاب کیسر لنگ ایک جرمن کی لکھی ہوئی تھی۔ یہاں بھی ساتھ تھی۔ مگر پڑھتے نہ تھے۔ یہ ایک سفر نامہ تھا۔ اس میں جن جن مقامات کا ذکر تھا وہاں کے آثار کو داخلی حیثیت سے بیان کیا تھا۔ ان تعمیر سے زیادہ مصنف جذبۂ تعمیر کو پیش کرتا تھا۔ عجیب کتاب تھی۔ سیدھی سادی با

تھی۔ بیان بھی صاف ستھرا۔ کوئی تعقید نہیں۔ مطالب میں باریکی اور گہرائی تھی۔ کتاب کو رکھے کئی دن ہوئے گئے تو میں نے پوچھا۔ کہنے لگے: "یہ کتاب پڑھتا ہوں تو سر میں درد ہو جاتا ہے۔ ایک صفحہ پڑھتا ہوں۔ دس صفحے سوچنے پڑتے ہیں۔ دلی جانے والا ہوں۔ وہاں کے کڑکڑاتے جاڑوں میں پڑھوں گا ——— تحانت میں دیکھے ہتولہ بنے بیٹھے ہیں، پاس انگیٹھی روشن ہے، نمکین پستے بادام پر پھنگیر سوبھی ہے اور کتاب پڑھی جارہی ہے!"

چوتھی بات ان میں یہ تھی کہ جو کچھ بھی لکھتے بہت اچھا کر لکھتے۔ اور اس میں توانائی ہوتی ہونی بھی تھی کہ وہ ایک کردار تھے۔ اسٹائل انسان کے شمائلِ نفسی کا دوسرا نام ہے۔ اونچے پورے آدمی۔ روز صبح کسرت کرتے۔ سڈول، توانا، مضبوط، جیسے ہندستان کی سرزمین پر یونان کا اپولو! ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ خان صاحب کے بے تکلف ایک دوست ان سے ملنے آئے۔ مل کر جانے لگے تو خان صاحب نے روکا۔ ان صاحب کو کوئی کام تھا۔ جانا چاہتے تھے۔ خان صاحب کسی کام سے ہٹے۔ اور وہ صاحب چپکے سے کھسکے، باہر تانگے میں جا بیٹھے۔ خانصاحب جو پلٹے تو انھیں نہ پایا۔ وہ بھی لپکے۔ اور تانگہ کا پہیہ پکڑ لیا تانگہ روک لیا۔ انھیں یقین تھا کہ گرتن بلوان تو من بھی بلوان! ترقی کا مفہوم ہی ان کے پاس یہ تھا کہ ہم اپنے میں قوت پیدا کریں اور قوت کے معنی یہ کہ "فطرت کی قوتوں پر چھا جائیں۔ مگر فطرت کی قوتیں بے شمار ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑی قوت، روحانی یا دماغی قوت ہے۔ یہ فطرت کی اور قوتوں کو لگام دے سکتی ہے۔"

اس لیے خان صاحب کے قلب و قلم سے جو ادب ہے۔ وہ اردو میں صحت مند، صحت آور، نیا اور ترقی یافتہ ہے۔ ایک ترقی یافتہ ادب یہ ہے۔ ایک وہ ہے جس کی ترقی کا آج کل ہمارے پاس غل مچا ہوا ہے۔ ایک بنانے والا۔ ایک بگاڑنے والا۔ میرا روئے سخن عام طور پر ترقی یافتہ ادب سے نہیں۔ میں یہاں ان مخصوص حضرات کا

حوالہ دے رہا ہوں جو ادب کا مرد کار تو بننا چاہتے ہیں مگر نہیں جانتے ادب کیا ہے! کم سوا، نہ نظر ہے، نہ ذوقِ سلیم، نہ شرافتِ نفس، نہ تہذیبِ خیال، بات اس طرح کہتے ہیں جیسے ایک مشہور جاندار آئنگ پر آکر بول رہا ہے!

خاں صاحب کی کرداری شان کا ایک واقعہ بھی یاد آ گیا۔ وہ امتحانات بکر مالی کے سکریٹری بھی تھے۔ ایک دفعہ ایک بہت بڑے عہدہ دار کا لڑکا امتحان میں بیٹھا اور بدرجۂ اعلیٰ فیل ہو گیا۔ سارے سررشتۂ تعلیم میں آنکھوں آنکھوں حشر بپا ہو گیا کہ اب کیا ہو گا۔ ہر چھوٹا بڑا دم بخود تھا۔ خاں صاحب بھی خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہے۔ آنکھ میں میل تک نہ آیا۔ مگر ایک وقت آیا کہ خاں صاحب بلوائے گئے۔ ہر ایک والا نے کہا کہ خدایا خیر! خاں صاحب جانتے تھے کہ ذرا سی الٹ پھیر سے آج دنیا بنتی بگڑتی ہے۔ گئے اور ان بڑے عہدہ دار سے ملے۔ باتوں باتوں عہدہ دار کے پرائیوٹ سکریٹری نے حرفِ مطلب چھیڑا۔ خاں صاحب نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ صاف کہہ دیا کہ ایک معتمدِ امتحانات کو جو کرنا چاہیئے تھا وہ میں نے کیا۔ اور جب تک معتمد ہوں مجھے یہی کرنا چاہیئے! اخلاق کی سچائی کا اثر ان بڑے عہدہ دار پر ہو کر رہا۔ بات بنا کر کہا: "آپ کو اس لئے بلوایا تھا کہ بچے کی تعلیم کے لئے مشورہ لیں۔ وغیرہ وغیرہ" وہاں سے پلٹے تو میں بیٹھا ہوا تھا۔ عادت کے موافق ہنستے مسکراتے آئے اور کہا: وہ مارا پاپڑ والے کو! پھر سارا ماجرا سنایا۔ عہدہ دار کی تعریف اور سکریٹری کی مذمت کی۔ کہا کہ سچ ہے: "آدمی ہی آدمی کا شیطان ہوتا ہے!" پھر جیب سے ایک کاغذ نکالا۔ وہ استعفیٰ تھا۔ لکھ کر ساتھ لیتے گئے تھے کہ کیا صورت ہو کیا نہ ہو۔

پانچویں اور آخری بات خاں صاحب کے پاس "مسہری" ہے! ان کی نثر ہو یا نظم ضرور ہے کہ اس میں چوڑیاں سی بجتی سنائی دیں۔ تندرست آدمی تھے۔ تندرستی کا تقاضا

ہی یہ ہے کہ زندگی شباب پر رہے۔ کہا کرتے تھے: ”عورت گوری ہو کہ کالی، سڈول ہو، جوان ہو، تندرست ہو تو میرے نزدیک حسین ہے!“ ایک دن کوئی پر لطف کتاب پڑھ رہے تھے۔ سگریٹ کی طلب ہوئی تو کتاب رکھ دی۔ ورجینیا تمباکو کا سگریٹ بناتے بناتے کہنے لگے: ”ایک صاحب ذوق کے لیے یہ سہولت ہونی چاہیے کہ کتابخانہ کے ساتھ ساتھ حسینوں کا ایک عجائب خانہ بھی رکھ سکے۔ کوئی دبلی، کوئی موٹی، کوئی بوٹی کوئی لمبی، کوئی گوری، کوئی کالی۔ مگر سب کی سب سڈول، جوان، اور تندرست!“ ان کی نظم میں یہ چیز خوب خوب مزاج پائی ہے۔ کبھی کبھی تو بات اس طرح کہتے ہیں جیسے دالہ و شیدا ہوئے جاتے ہیں:

ترے بھولے سے مکھ پہ میں — دل و جاں فدا کروں
ترے جوبن پہ سکھ پہ میں — مری جان مٹا کروں
ابھی آنکھ ڈری سی ہے — ابھی آگ دبی سی ہے!

خان صاحب کا یہ جذبہ دن بدن نکھر تا جار ہا تھا۔ پہلے یہ رنگ حیا تیاتی تھا:

سندر صورت سندر ہی ہے — رنگت گوری یا کالی
فطرت نے ہو جس رنگ میں ڈھالی
فطرت کے لئے حسن یہی ہے — سُکھ دُکھ گرمانے والی
جان کی کھیتی جوتنے والی!

پھر رومانیاتی ہوا:

کیا کھیل ہے دلداری؟
یہ کھیل نہیں پیاری
ہے کام بڑا بھاری

دل ٹوٹ کے آتا ہے، دل ٹوٹ بھی جاتا ہے

اک آن میں لٹ جائے

اک پل میں آکر جائے

اک دم میں بگڑ جائے

احساس کا دھندا ہے، الفت کا یہ بندا ہے

پھر روحانیاتی ہوا:

کیا تم نے خود ہی اصرار / کہ کردوں میں عقد ثانی

رہا گو مجھے تو انکار / پر نہ تم نے ایک مانی

چنی آپ سوت تم نے، کی پسند سوت تم نے!

ہوئے مجھ کو بال بچے / مرا دل رہا تمھارا

بنے ہم وہ دوست سچے / کہ جہاں سے ہے پیچ سارا

مری آتما تھی پیاری، مری آتما تمھاری!

یہ کھلا نکاح اپنا / کہیں ایسا ہوا ہے پہیلی

یہ نہیں بدن کا چھپنا / یہ ہے برق روح ساری

مرا دل بھی رہین تم ہو، مرا اصلی چین تم ہو!

یہاں تک کہ بالیدہ ہو کر اُن کا یہ جذبہ کونیاتی بن جاتا ہے:-

بھور بھئی ہے صبح کی دلہن / نے سیج پر لی ہے انگڑائی

بگڑی بکھری رات کی بن ٹھن / وہ شرکی تاروں کی دُلائی

رات کے کالے بادلوں میں سے چاند سی صورت وہ مسکرائی!

سورج دولہے نے کروٹ لی / سندر کو کچھ دُور جو پایا

اور گھلاوٹ سو بہار دیکھی   اپنا سنہری ہاتھ بڑھایا
کرنوں میں لیا پتلی کی طرح آنکھ میں اپنی اس کو بسایا!

ایک نظم میں طوائف زبانِ حال سے کہتی ہے :۔

مرے بال کالے لانبے لانبے کہ اٹھا ہو جیسے ابر کالا
مرا سینہ بھی اُمڈتا بادل بھری بجلیوں سے تھرتھراتا
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے، وہ ہوں آج جسکی کل نہیں ہے!

کالی کالی جھومتی گھٹا، اُمڈ اُمڈ کر چھاتے بادل، کوندتی بجلیاں! اور طوائف کا سراپا!!
لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ !!!

ایک دن کا ذکر ہے کہ خاں صاحب اپنے دیوان خانہ میں بیٹھے "شاعر" ایک ڈرامہ لکھوا رہے تھے۔ وہ کہتے جاتے تھے۔ میں لکھتا جاتا تھا۔ مولیئر کے دو ایک ترجمے بھی انھوں نے ایسے ہی کئے۔ میں یا ابوالخیر مودودی لکھا کرتے تھے۔ اتنے میں ہانپتے ٹہلاتے آغا فرحت (مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی) آ گئے۔ لکھنا بند ہوا۔ اُن سے مذاق ہونے لگا۔ باتوں باتوں "شاعر" کا بھی ذکر نکلا۔ کچھ انھیں بھی سنایا۔ نئی چیز تھا۔ انھوں وہ ڈرامہ گم ہو گیا! ہوتے ہوتے اردو شاعری پر بھی بات نکلی۔ خاں صاحب ان دنوں تلے بیٹھے کہ اُردو شاعری کی دُھول جھٹک دیں۔ بات نکلنی تھی کہ برس پڑے۔ دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ خاں صاحب چھائے رہے۔ دوسرے دن "شاعری" والے یادگار مضمون کی پہلی قسط سنائی۔ خاں صاحب کا دیوان خانہ ملنے والوں سے کبھی خالی نہ رہا۔ چھوٹا سا تھا۔ لب سڑک تھا۔ بیروں گرد آتی رہتی تھی۔ آغا فرحت کا تو کہنا ہے کہ خاں صاحب کو دق اسی دیوان خانہ سے ہوئی۔ خیر، تو دو چار ملنے والے دیوان خانہ میں بیٹھے ہی رہتے تھے۔ بقول آغا فرحت: "آرام کرسی بچھی ہے عظمت اللہ خاں

بیٹھے ہیں۔ اِدھر اُدھر کرسیوں پر ملنے والے بیٹھے ہیں۔ کسی کے مضمون کی تعریف ہو رہی ہے، کسی کو مشورہ دیا جا رہا ہے، کسی کو سمجھا رہے ہیں، کسی کو پڑھا رہے ہیں، غرض ایک ادیب کا دربار لگا ہوا ہے!" اس وقت بھی لکھنؤ کے نوابین میں سے ایک صاحب بیٹھے تھے ــــــ چُنی ہوئی دوپلڑی، چنا ہوا انگرکھا، آنکھ میں سرمہ، منہ میں گلوری، ہاتھ میں تسبیح، بگلا داڑھی، بگلا سر، جیسے حضرت جبرئیل بیٹھے ہوں! ان صاحب نے مضمون میں شروع بسم اللہ ہی یہ سُنا:۔

کوئی کی نفیس آنکھ وارفتہ گھومتی
نظر ڈالتی ہے زمیں پر کبھی آسماں پر
تو جوں جوں تخیل میں ڈھلتے ہیں انجانی پیکر
کوئی کا قلم ان کی شکلیں بنا کر
مصوّر بھی کرتا ہے ان خواب کی سی ہستیوں کا
مقام ایک بسنے بسانے کو، ایک نام!

لکھنوی بزرگ چراغ پا ہو گئے۔ فرمایا: "خاں صاحب! واللہ آپ نے تو کمال کر دیا۔ زبان، عروض دونوں کا گلا گھونٹ دیا۔ اے حضور! آپ دلّی کے ہیں، آپ کو تو یہ بات زیب نہیں دیتی!" خاں صاحب نے عادت کے موافق ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ مگر اُن کے اس ہنسنے میں تلخی تھی۔ شہد میں شیر کا خون بھی آملا تھا۔ اس طرح کی رجعت پسندی اور زبان دانی کی خالی خولی ڈھکوسلا بازی سے انھیں نفرت تھی۔ اس لئے سرخ ہو گئے۔ ڈاکٹر مسعود حسن نے سچ کہا ہے کہ خاں صاحب اردو ادب کے باغی ہیں۔ اب کیا تھا پوری باغیانہ عظمیت پر اُتر آئے۔ ان بزرگ سے کہا: "مشفق! زبان اور عروض اُن کی باندیاں ہیں جن کے قلم میں زور ہے۔ وہ جب چاہیں تصرف

کر سکتے ہیں!"

یہی چیز تھی جس نے خاں صاحب کو عربی، انگریزی اور ہندی عروض سے مدد لیکر اردو کے عروض کو ناپیدا کنار بنانے پر ابھارا۔ اس خیال پر جما یا کہ اُردو میں شاعر کے پھولنے پھلنے کے لئے ضروری ہے کہ پوری پوری آزادی ملے۔ جتنے بھی ہوں ترنم کے سانچے اُس کے سامنے رہیں۔ شاعر جب چاہے انھیں خیال کے مطابق لچکیلا بنا لے۔ میرا خیال ہے مولانا حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کے بعد اردو ادب میں خاں صاحب کی یہ کوشش دوسری زندۂ جاوید کوشش ہے۔

"شاعری" والا مضمون پورا ہوا۔ ڈاکٹر عبدالحق کے کہنے پر رسالہ اردو میں چھپا۔ ہر طرف سے مبارک باد آنے لگی۔ خاں صاحب ان دنوں ایسے نہال اور مالا مال دکھائی دیتے تھے جیسے کہیں کی بادشاہت مل گئی! اب کبھی انگریزی سے کوئی نظم اُردو میں لیتے۔ کبھی کوئی نظم خود کہتے۔ جب دیکھو دیوان خانہ میں شعر و شاعری کی چہل پہل ہے۔ جس روز کا یہ ذکر ہے براؤننگ کی ایک نظم کو "چھبیل چھبیلی" کے عنوان سے اردو میں لیا تھا:-

وہ بوٹی کھجوری کہ لہراتی ناگن
وہ ہرنی کی آنکھیں سیاہ اور بڑی
رسیلی چمک ان میں وہ شبنمی
وہ بچپن کی سی تازگی، چھایا جوبن!

یہ نظم سنا رہے تھے کہ مرزا رفیق بیگ دہلوی آگئے۔ اس وقت ان کا دیوان خانہ یونیورسٹی کالج کے طلبہ سے بھرا ہوا تھا۔ بیگ صاحب کو خاں صاحب نے اپنی ہی کرسی پر بٹھا لیا۔ انھیں بھی نظم سنائی۔ اور گھنٹوں ہنستے بولتے۔ خاں صاحب کے پاس آکر جانے

جی نہیں چاہتا تھا۔ وقت گزرتا معلوم ہی نہ ہوتا۔ اس اثنار میں نہ جانے کس چھپا کے میں اندر جاکر کھانا کھا آئے۔ وہ کھانا بہت تھوڑا، بڑا نفیس، اور بیحد جلدی کھاتے گئے۔ ہاتھ دھویا۔ کُلّی کی۔ اور دستر خوان پر ہو بیٹھے۔ اور بات کی بات میں کھڑے بھی ہو گئے۔ جیسے کھانے کو دیکھکر چلے آئے! اور پھر ہنسنے بولنے لگے۔ بیگ صاحب بھوک سے بلبلا گئے تو اُن سے نہ رہا گیا۔ اُٹھ گئے۔ خاں صاحب نے پوچھا: "کیوں؟" انھوں نے کہا: "بھوک سے بُرا حال ہے، جاتا ہوں، پھر آؤں گا۔" خاں صاحب بولے: "ارے بھئی تم تو بھوک کے بڑے کچے نکلے۔ مجھے بھی تو دیکھو: ابھی ابھی کھانا کھایا ہے، مگر کس صبر سے بیٹھا باتیں کر رہا ہوں!"

(۴)

خاں صاحب نے اپنی نظمیں اپنے مفروضات کو مادی روپ میں دیکھنے کے لئے بھی کہیں۔ ان کا "فارم" جیسا کہ انھوں نے خود بتایا "بی رِکْ" ہے۔ وہ "لائر" (ساز) جس پر یونانیوں کی طرح وہ اپنے جذبات گایا کرتے تھے۔ ذاتی جذبہ "بی رِکْ" کی روحِ رواں ہوتا ہے۔ خاں صاحب کی ہر نظم اُن کے ذاتی جذبہ کی ایک تان ہے۔ اور جس کا منشا انھیں کے الفاظ میں یہ ہے:۔

"اُس آنے والی پود کے لئے جس کے ہونٹوں پر ابھی ماں کے دودھ کا مزہ کچھ یونہی سا باقی ہے، جس کی آواز میں ابھی لڑکپن کا سُریلا پن گونج رہا ہے، یہ چند "بی رِکْ" نظمیں سوغات کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ اس پود کا پھولنے پھلنے کے بعد بڑا کام یہ ہوگا کہ اس کی نغمہ سرائی سے اُردو شاعری فطرت کی طرح وسیع ہو جائے اور فطرت ہی کی طرح گونج اٹھے۔ اگر ان چند بولوں سے اس پود کو اردو ادب کا ایک نیا دور طلوع کرنے میں ذرا سی بھی مدد ملی تو گویا ان ناچیز چیزوں کا صلہ مل گیا!"

خاں صاحب کے اس منشا میں ایک خلوص، اور ایک گہرائی ہے۔ خار مم بھی ان کے جذبہ و خیال کے لوچ پر پورا اترا۔ اس لئے ان نظموں کا جو اثر ہونا چاہئے تھا وہ ہی ہوا۔ اردو شاعری پر اس دن سے ایک بہار آگئی۔ کہنے، سننے، دیکھنے، اور سوچنے کے سوتے سے کھل گئے۔ نئی پود میں سے ہر ایک اپنے کو آزاد سمجھ کر شعر کہنے لگا۔ افراط تفریط ایسے موقعوں پر ہوا کرتی ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ یہ بات بھی نہ رہے گی اعتدال آجائے گا۔ خاں صاحب کا ارمان پورا ہو کر رہے گا۔ اردو شاعری فطرت کی طرح وسیع ہو کر گونج اٹھے گی!

تو، اپنی نظموں میں خاں صاحب نے وہی باتیں کہی ہیں جو ان کا ذاتی جذبہ ہیں اور جو اُن کے دل سے نکلتی ہیں۔ ایک دفعہ میں گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ دیکھا کہ ڈاڑھی بنا رہے ہیں۔ ان کی عادت تھی کہ اس وقت اپنا کلام گنگنایا کرتے تھے۔ آج چپ تھے۔ ان کا ملازم کلّو اندر سے پہلے ایک گلاس میں پسی ہوئی سونف کا شیرہ لایا۔ وہ پیا۔ پھر ایک گلاس میں دودھ لایا۔ وہ پیا۔ مگر چپ چپ۔ یہاں تک کہ ڈاڑھی بنا چکے۔ پھر اپنے بے دھڑک انداز میں بولے: "یہ جو مرد کے نام سے ایک جانور ہے وہ اصل میں نامرد ہے!" یہ کہتے ہوئے پاس ہی میز پر سے ایک کاغذ اٹھایا اور پڑھا: "میرے حُسن کے لئے کیوں مرے، نہیں لینے تھے تمھیں یوں مرے!" اس نظم کا ایک بند پڑھ کر تو میں نے دیکھا کہ سُرخ ہو گئے۔ بند یہ تھا:-

مری چاہ لی مرا دل لیا جو طلب کیا وہ تمھیں دیا
جوں ہی حُسن سے مرے دل بھرا وہ پھری نگاہ، وہ دل پھرا
مرے حسن کے لئے کیوں مرے، نہیں لینے تھے تمھیں یوں مرے!

پھر کہنے لگے: "سچ ہے: ہرجائی عورت نہیں، مرد ہے ہرجائی! یہی ایک کو چھوڑتا، دوسری کو

کرتا ہے۔ عورت ایک کی ہو کر رہتی ہے۔ اور باتوں کو جانے دو۔ عورت جب سے ماں بننے والی ہوتی ہے۔ جب سے تو آمرا ڈھونڈے بنا نہیں رہ سکتی۔ اور ماں بن کر تو وہ ایسا سہارا چھوڑ ہی نہیں سکتی جو اس کو اس کے بچہ کو پالے اور پروان چڑھائے۔ یہی ایک بات عورت کو ایک کا ہو رہنے کے لئے بہت کافی ہے۔ مرد کو ایسی کوئی روک نہیں۔ اس لئے وہ ہرجائی ہے!" نقطۂ نائی۔ ناشتہ کیا۔ دفتر چلے۔ میں بھی اپنے دفتر بارہا ساتھ ہو گیا۔ دفتر گھوڑا گاڑی میں جایا کرتے تھے۔ انہیں چپ چپ دیکھ کر مجھے اچھا نہیں معلوم ہوا۔ کہا: "اب تو آپ بھی موٹر لے لیں۔" فرمایا: "اور احساس ہو جائے گا!" میں نے پھر چھیڑا: "آپ کے اس گھوڑے سے تو اب ڈر ہوتا ہے!" پوچھا: "کیوں؟" میں نے کہا: "سودا کا گھوڑا بن گیا ہے۔ ایسا نہ ہو خدا گنج پہنچا دے!" اب کیا تھا کھل گئے۔ خوب ہنسے۔ پھر وہی ہنسی مذاق تھا۔ پھر وہی خان صاحب۔ کچھ دن بعد موٹر بھی لے لی۔

(۵)

خان صاحب کے شاعرانہ شعر میں شعر وہی ہے جس میں شاعر کا جذبہ ایک تخیلی پیکر بن کر سامنے آئے۔ اس لئے ان کی ہر نظم منہ بولتی ایک تصویر ہے۔ ان کی آنکھوں میں کبھی نفاست ہے، وارفتگی ہے۔ وہ کبھی زمین سے آسمان اور آسمان سے زمین دیکھتی ہے۔ ان کا تخیل بھی انجان چیزوں کو جانا بوجھا دیکھا بھالا بنا دیتا ہے اور انہیں ایک نام و مقام دیتا ہے:-

وہ لڑائیاں بھی کبھی کبھی	کبھی روٹھنا کبھی من گئے
ابھی کٹیاں تو ملاپ ابھی	ابھی چٹکیاں ابھی قہقہے

تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ مزے کی آنکھ مچولیاں — وہ چھپوں کو ڈھونڈ نکالنا
یونہی ناچنا یونہی تالیاں — یونہی ہاتھ پیر اُچھالنا
تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ تمھاری گڑیا کی شادیاں — وہ مرا برات کا انتظام
مرا باجہ ٹین کا سیٹیاں — بڑا شور و غل بڑی دھوم دھام
تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مرا بن کے قاضی وہ بیٹھنا — کہ بیان اس کا فضول ہے
مرا پوچھنا کڑک کے کیا — میاں گڈے گڑیا قبول ہے
تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو!

کتنی زندہ چیز ہے! معلوم ہوتا ہے ماجرا ہمارے بچپن کا ہے۔ کہہ وہ رہے ہیں۔
اپنی اس پیکرِ خیالی سے وہ بے جان میں بھی جان ڈال دیتے ہیں:۔

آئے بادل کالے کالے جھومتے ہاتھی متوالے
اڑتے پھیلے تُلتے جھکتے
ایک اندھیری دیکر چھائے ڈیرے چار طرف ڈالے
پون کے گھوڑے سہمے ٹھٹکے

....
....
....

پھٹ گئے بادل ابر کے ٹکڑے بہار اپنی دکھلاتے
طرح طرح کی شکلیں بناتے
پھیلتے پھٹتے، پھٹتے ملتے، ملتے سمٹتے سمٹاتے
دوڑتے تھمتے چلتے چلاتے!

ایک اور نظم دیکھیے :-

بھلا حقّہ کے کیا کہنے ہیں حقہ کا حال پوچھنا کیا ہے
کہنے کو بے جان ہے حقہ

اس رمز کو وہی جانتے ہے، جان جو اس پر دیتا ہے
زندہ دل انسان ہے حقہ

وقت سی شئے کو بہلاتا ہے، گڑ گڑ گڑ گڑ گیت یہ گاتا ہے

"آرام کا دن کو سہارا ہوں
راتوں کو چین کا تارا ہوں
دکھ سکھ میں دوست تمھارا ہوں
سب کے من کا پیارا ہوں
دم سے میرے دم آتا ہے
شانتی آتی غم جاتا ہے!"

روشن دل کی طرح فکرِ سخن میں مضمون سجھاتا ہے
بے مثل استاد ہے حقہ

بادل کی طرح کڑک کڑک کر لفظوں کا مینہ برساتا ہے
خود ہی دیتا داد ہے حقہ

خود ہی شعر کہلاتا ہے، گڑ گڑ گڑ گیت یہ گاتا ہے

"آرام کا دن کو سہارا ہوں
راتوں کو چین کا تارا ہوں
دکھ سکھ میں دوست تمھارا ہوں

سب کے من کا پیارا ہوں

دم سے مرے دم آتا ہے
شانتی آتی غم جاتا ہے!"

یہ نظم نہیں، سچ مچ کے مرزا جی ہیں۔ یہ اُن کا تازہ تازہ، سُوندھا سوندھا، لہکتا مہکتا خُفّہ ہے۔ کبھی برسات ہے، کبھی گرمی ہے، کبھی سردی ہے، اور مرزا جی بیٹھے گڑگڑا گڑ پی رہے ہیں!

خاں صاحب کی نظمیں پڑھیئے۔ مانا کہ گنتی کی ہیں۔ مگر ان سے پتہ چل جاتا ہے کہ ان کا کہنے والا پیدائشی شاعر ہے۔ وہ اور زندہ رہتے تو اس رنگ میں بھی ان کا "جی نی اُس" اور کھلتا۔ اُن کے ہاں بھی بزبان غالب "اُدھر کا اشارہ" ہے بقول ورڈسورتھ ایک اُجالا، جو شاعری کی جان ہے:۔

حُسن یہ من کا کھیل ہے من نہیں تو سب مٹی
من موہن پر روشنی آتما کے سورج کی!

(۶)

ایک بات خاں صاحب کے ہاں اور بھی بڑی نرالی ہے۔ بعض مرتبہ ہنستے ہنساتے ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ لذتِ احساس دُکھ کی چاشنی بھی دے جاتی ہے۔ کوئی کچھ کہے میرا تو یہ کہنا ہے کہ اُن کے پاس محبت کی کوئی بڑی ناکامی تھی جسے ہنس کر چھپاتے اور گا کر بھلاتے تھے:۔

مجھے جیتے جی پیت کا پھل یہ ملا
مرے جی کو یہ آگ لگا ہی گئی
مجھے پیار کی ریت کا پھل یہ ملا!
مرے تن کو یہ آگ جلا ہی گئی!

اس نتیجے پر میں اُس بحث کے بعد پہنچا۔ جس کا اکھاڑا بادشاہ بخیر حامد کیسل تھا۔ یہاں ذہنی لڑائیاں ہوا کرتی تھی۔ تعریف اس کیسل کی یہ ہے کہ فنِ تعمیر کے ہر اصول کے خلاف بنا تھا۔ اور اعجاز اس کا یہ تھا کہ اسی زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے قائم تھا۔ جہاں بڑے بڑے اصول ٹوٹ گئے ہیں! حامد مرزا (اب انھیں پرنس نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیسل نہیں رہا!) خاں صاحب کے ہم زلف ہیں۔ وہ ان دنوں انجینرنگ کالج میں پڑھتے تھے اور اس کیسل کے پرنس تھے۔ یہیں ایک طرف اُن کی مسہری لگی ہوئی تھی۔ اسپرا سٹول پھر ایک سفید مچھر دان پڑا رہتا تھا۔ یہ ان کا تاج محل کہلاتی تھی! خاں صاحب منجھلے میرے بھائی احمد الدین مرحوم، سنجھلے میرے بھائی معین الدین، اور میں اِس پرنس کی وفادار رعایا میں سے تھے! شام کو سب کورنش بجا لانے کیسل آجاتے۔ پہروں ہنستے بولتے۔ جس روز کا یہ ذکر ہے۔ بحث یہ تھی کہ خاں صاحب کے پاس لوگوں کا آنا جانا کسی صورت کم ہونا چاہئیے "تا کہ اُن کا وقت بچے۔ اور وہ اور اچھے اچھے کام کر سکیں۔ مگر طویل بحث کے بعد ہم سب اس نتیجے پر پہنچے کہ خاں صاحب بڑے سوشیل آدمی ہیں۔ ان کے پاس لوگوں کا آنا جانا کم ہوا تو خود اُن کو بار ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ جتنے زیادہ لوگ اُن کے پاس آتے ہیں۔ سمجھئے وہ اتنی ہی زیادہ کتابیں پڑھ لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ نفسیات کے آدمی ہیں۔ سچ بھی یہ ہے دن میں وہ انسانوں کو پڑھا کرتے تھے۔ رات میں ادبی کام کیا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ رات کے اندھیرے اور سناٹے میں کام خوب ہوتا ہے۔ گزری باتیں پریاں بن بن کر آتی ہیں۔ بہت سی ایسی باتوں کی پرچھائیاں بھی آتی اور کانا پھوسی کر جاتی ہیں جو دن کے اجالے میں آتے شرماتی ہیں! جس زمانے میں وہ حضرت خواجہ میر دردؔ پر مضمون لکھ رہے تھے انھوں نے ایک ایسا واقعہ بیان کیا کہ اب تک رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کہنے لگے: "رات کے کوئی دو بجے ہوں گے کہ میری آنکھ کھل گئی۔ سناٹے کا عالم تھا۔ حضرت دردؔ کی شاعری پر ان دنوں لکھنے کا ارادہ تھا۔ بیسیوں باتیں سوجھنے لگیں۔ اٹھا۔ دیوان خانہ میں گیا۔ لائٹ کی۔

اور لکھنے بیٹھ گیا۔ لکھنے میں محو تھا۔ ڈرو گے شروں سے مَن چرا غاں کہ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی آکر میرے پیچھے کھڑا ہے۔ اور دونوں ہاتھ شانوں پہ رکھ کر جو میں لکھ رہا ہوں اسے پڑھ رہا ہے۔ پلٹ کر دیکھتا ہوں تو کوئی نہیں!"

اسی کیمپ میں ہم نے خاں صاحب کی نظم ––– پپیہا آخری مرتبہ ان کے جیتے جی پڑھی تھی۔ کیمپ کے قواعد مجبور کرتے تھے کہ ان کا سارا کلام کورس میں پڑھا جائے۔ آخری دو بند بھی مرتبہ کورس کئے گئے۔ ہر دفعہ نیا لطف آتا تھا:

میری ہستی بھی اے پپیہا! تیری سی اونچی گہری ہو
گھنی گھنی جھیلی جھپیلی ہو
جان کی سوتوں تک اک اک جٹا گہرائیوں میں پہنچی ہو
آندھیاں جھیلی مضبوطی ہوتا
سوکھے سکھائے آدھ موئے بیدم جھڑ جائیں من کے پتے
انہیں پتے تازے تازے
سے کوئی بیکل روح بسیرا بھٹکا من چھاؤں میں بیٹھے
پچھی کو ہاتھ آئیں پپیہے!

جیسے ہی کورس ختم ہوا بڑوں سے ایک بڑی بی نے از راہ قدر دانی داد بھی دی: "ہائی ٹیلے آج کچے گھڑے کی سبیلدھی پی آئے ہیں!"

کچھ عرصے بعد خاں صاحب کو دق نے گھلانا شروع کر دیا۔ شمع کے مانند ابھی کچھ تھے۔ ابھی کچھ۔ یہ خیال غلط ہے کہ وہ شراب پیتے تھے۔ اس سے انھیں دق ہوئی۔ پھر وہ مدن پلی گئے۔ وہاں کچھ سنبھلے تھے کہ فالج ہو گیا۔ حیدر آباد سے میں اور ابوالخیر مودودی مدراس سے حامد مرزا اور معین الدین گئے مگر پہنچے پہنچے کام تمام ہو چکے تھے!

مگر خاں صاحب وہ نہیں ہیں جنھیں دق نے پھونک دیا۔ خاں صاحب وہ نہیں ہیں جنھیں فالج ہوا۔ خاں صاحب وہ نہیں ہیں جنھیں منوں مٹی تلے ہم مدن پلی چھوڑ آئے۔ خاں صاحب وہ ہیں جنھیں ابھی ابھی آپ نے اُن کے کلام میں دیکھا ––– خدا کا خواب، میرا خیال!

پیام و سلام

[برادرم علی اسد اللہ خاں (فرزند محترمی محمد عظمت اللہ خاں دہلوی) میرے اُستاد زادے بھی ہیں۔ انھوں نے بمبئی سے "آرٹ" "ایک باقی منتقلی" رسالہ نکالا جسکے اڈیٹرز کے نام یہ چند سطریں ہیں۔]

(۱)

اسدؔ اللہ خاں، اور منصور! "آرٹ" والے بن رہے ہو تو پہلے سب کی بھلائی کے لئے قسم کھاؤ۔ کہو اور کرکے بھی دکھاؤ کہ آرٹ وہ کر سکتا ہے جس سے بہتر دنیا، دنیا بن سکے۔ نہ جس سے کمتر دنیا، دنیا رہ سکے!

(۲)

"آرٹ" کے مبارک ہاتھوں خدا کرے تمھاری نظروں حُسن کا رنگ رسُ آجائے، تمھاری باتیں محبت کے صنم بن جائیں، ملک اُمنگ ترنگ کا سُر ساگر بنے، قوم درد و آرزومندی کا گیت!

(۳)

آرٹ بہت ہے۔ وقت کم۔ حاشا یہ بات نہ بھولنا۔ انسان ہزار تو انا سہی، جیالا سہی، قدم اُس کے قبر ہی کی سمت ہیں۔ کوئی نقش ایسا چھوڑ جانا جس کو دوام ہو، جس سے آنے والے راہِ نجات پائیں۔ مگر یہ بات بھی سوچ سمجھ لو:-

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر!